امام احمد رضا کا فقہی کمال

فتاویٰ رضویہ جلد ہفتم کے آئینے میں

سنہ تالیف (۹-۲۰۰۸ء)

تحقیق و تالیف

مفتی محمد رضا قادری

استاذ: جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ

نظر ثانی

خیر الاذکیا، صدر العلما علامہ محمد احمد مصباحی

ناظم تعلیمات و سابق صدر المدرسین جامعہ اشرفیہ مبارک پور

ناشر

کتب خانہ قادریہ

مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ، یوپی

امام احمد رضا کا فقہی کمال
فتاوی رضویہ جلد ہفتم کے آئینے میں

تحقیق و تالیف

۲۰۰۸-۹ء

مفتی محمد رضا قادری

استاذ: الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور

ضلع اعظم گڑھ، یوپی

نظر ثانی

خیر الاذکیا، صدر العلما، علامہ محمد احمد مصباحی

ناظم تعلیمات و سابق صدر المدرسین جامعہ اشرفیہ، مبارک پور

ناشر

کتب خانہ قادریہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی

نام کتاب: امام احمد رضا کا فقہی کمال فتاوی رضویہ جلد ہفتم کے آئینے میں

تحقیق و تالیف: مفتی محمد رضا قادری

نظر ثانی واصلاح: خیر الاذکیا، علامہ محمد احمد مصباحی

ناظم تعلیمات جامعہ اشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ

باہتمام: حضرت مولانا غلام نبی رضوی

ساکن: لہرپٹی، ضلع مہوتری، نیپال۔ مقیم حال: بلدیہ، قطر

تعداد صفحات: ۱۷۶

اشاعت اول: اپریل ۲۰۲۱ء/شعبان ۱۴۴۲ھ

ناشر: کتب خانہ قادریہ، مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ، یوپی

قیمت: IC 150

ملنے کے پتے

(۱) جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، عالیہ بلڈنگ کمرہ نمبر 16 ۔ **7521064491**

muftimohdrazaquadrimisbahi@gmail.com

(۲) سنی پبلی کیشنز، دریا گنج، دہلی **9867934085**

(۳) خانقاہ قادریہ، چشتیہ راہ سلوک، چاند پور، ضلع مرادآباد، یوپی

(۴) مرکزی آفس راشٹریہ علما کونسل، نیپال، **00977-9806951702**

(۵) برکاتی منزل، جنک پور، اسٹیشن محلہ، وارڈ ۱ ضلع دھنوشا، نیپال

00977-9817865996

(۶) مجلس برکات، الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور

عنوانات

تفصیلی فہرست

فکر انگیز تحقیقات ۷۳

اعلیٰ حضرت کی فقہی تحقیقات پر مفتی محمد رضا قادری کا محققانہ جائزہ

از قلم: طفیل احمد مصباحی (سابق ایڈیٹر ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور)

مجددِ اسلام، فقیہِ اعظم، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان محدث بریلوی علیہ الرحمہ (متوفیٰ: ۱۳۴۰ھ) کے علمی جاہ و جلال کا ایک جہان معترف ہے۔ پچاس سے زائد علوم و فنون پر تقریباً ایک ہزار کتب و رسائل آپ کے علمی تبحر، فقہی کمال، شانِ اجتہاد اور "جامع العلوم و الفنون" ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ آپ صحیح معنوں میں بقیۃ السلف اور عمدۃ الخلف تھے۔ صدیوں پہلے وفات پانے والے علمائے کرام و فقہائے عظام کی علمی فتوحات اور ان کی ہمہ جہت دینی و ملی خدمات کا جو حال تاریخ کی کتابوں میں ہم پڑھاتے کرتے تھے، امام موصوف کی عہد ساز شخصیت نے اس کی یاد تازہ کر دی ہے۔ ان کی عبقریت، علمی جلالت اور رسوخ فی العلم نے پورے عہد کو متاثر کیا اور اور اساطینِ ملت سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ علوم و فنون کی شاید ہی کوئی ایسی شاخ ہو جس پر اس شاہین صفت عالم و مجدد کی فلک پیما فکر نے اپنا آشیانہ نہ بنایا ہو۔ یوں تو آپ تمام مروجہ علوم و فنون کے امام تھے، لیکن خصوصیت کے ساتھ علمِ تفسیر و حدیث اور فقہ و افتا میں اس بلندی پر فائز تھے، جس کے آگے بڑے بڑے کج کلاہانِ فن کوتاہ قد نظر آتے ہیں۔ آپ کی جملہ تصانیف میں تحقیق و اجتہاد کا رنگ غالب ہے۔ بارہ جلدوں پر مشتمل "فتاویٰ رضویہ" ایک عظیم علمی و فقہی دائرۃ المعارف ہے، جس میں آپ کی فقہی مہارت و بصیرت اپنے نقطۂ انتہا پر دکھائی دیتی ہے۔

اعلیٰ حضرت کی غیر معمولی فکر و شخصیت اور ہمہ جہت دینی و علمی خدمات پر سینکڑوں کتب و رسائل اور ہزاروں مضامین و مقالات لکھے جا چکے ہیں، لیکن اس سمندر میں موجود

بیش قیمت جواہرات کا احاطہ اب تک نہیں کیا جا سکا ہے۔ ہمارے یہاں تقلید و روایت کا رجحان عام اور تحقیق و درایت کا کافی حد تک فقدان ہے۔ کسی محقق یا اہلِ قلم نے ایک موضوع پر قلم کیا اٹھایا کہ اس کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے دھڑا دھڑ قلم چلنے لگتے ہیں اور مضامین کے انبار لگ جاتے ہیں۔ امام موصوف کی حیات و خدمات پر اب تک جتنے مضامین و مقالات لکھے جا چکے ہیں، ان سب کو سامنے رکھ کر اگر ان کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو پچہتر فیصد کام نقل و روایت اور تقلیدی نوعیت کے حامل نظر آئیں گے۔ گویا چبایا ہوا لقمہ چبانا ہماری تحریری روایت کا حصہ بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ردِ وہابیہ اور دیگر اختلافی موضوعات پر ہمارے یہاں کتب و رسائل کی کمی نہیں۔ باقی حدیث، اصولِ حدیث، علمِ قرآن و تفسیر، تاریخ و سیاست، صحافت، اقتصاد و معیشت، قاموس و لغات، درسی کتب کے شروح و حواشی جیسے موضوعات پر علمائے اہلِ سنت کی کتابیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتیں۔ مذکورہ بالا عناوین پر اگر کچھ کتابیں ہیں بھی تو ان کی حیثیت آٹے میں نمک کے برابر ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان محدث بریلوی کی علمی و فقہی خدمات پر خالص علمی و تحقیقی نقطۂ سے تحریر کردہ کتب و رسائل میں ایک اہم کتاب "امام احمد رضا کا فقہی کمال: فتاویٰ رضویہ جلد ہفتم کی روشنی میں" بھی ہے، جس میں ایک محقق کا تحقیقی رنگ و آہنگ، ایک جید عالم کی علمی مہارت اور ایک مفتی کا فقہی انداز و اسلوب جا بجا نظر آتا ہے۔ رضویات کے حوالے سے اس قسم کی علمی و تحقیقی کتاب کم ہی وجود میں آتی ہے۔

مؤرخِ اسلام، نازشِ علم و حکمت حضرت مولانا مفتی محمد رضا قادری دام ظلہ العالی (استاذ جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی) ایک ابھرتے ہوئے جواں سال عالم و فاضل، باصلاحیت مفتی، کامیاب مدرس، ممتاز اسلامی اسکالر، تاریخ و تصوف پر گہری نظر رکھنے والے عظیم محقق و مؤرخ اور مختلف موضوعات پر تقریباً تین درجن کتابوں کے بلند پایہ مصنف ہیں۔ مزاج میں تحقیقی رنگ غالب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں، اس کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ ساڑھے چھ سو صفحات پر مشتمل ان کی کتاب "نیپال میں

اسلام کی تاریخ" ان کی تحقیقی و تصنیفی مہارت کی دلیل ہے۔ کم گو اور بسیار جو ہیں۔ ہمیشہ علمی و تحقیقی کاموں میں مصروف رہتے ہیں اور قوم و ملت کی فلاح و بہبود میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ ان کی علمی و تصنیفی فتوحات قابلِ قدر اور لائقِ رشک ہیں۔ علاوہ ازیں بھرپور تنظیمی اور قائدانہ صلاحیتوں کے بھی مالک ہیں۔ "تعمیرِ امت نیپال" ان کی قائدانہ صلاحیتوں کی غماز ہے۔ غرض کہ اللہ تعالیٰ نے موصوف کو بہت ساری خوبیوں سے نوازا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیبِ پاک صاحبِ لولاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقے گلشنِ علم و تحقیق کے اس گلِ سرسبد کو ہمیشہ شاداب و نکہت بار رکھے۔ آمین۔

زیرِ نظر کتاب (امام احمد رضا کا فقہی کمال: فتاویٰ رضویہ جلد ہفتم کی روشنی میں) ایک سو اٹھاون صفحات پر مشتمل ہے، جسے مصنف نے تیرہ ذیلی عناوین میں منقسم کیا ہے اور ہر عنوان کے تحت سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے اس کے تمام ممکنہ گوشوں پر خالص تحقیقی انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کے مندرجات کا مطالعہ کرنے کے بعد جہاں اعلیٰ حضرت کی حیرت انگیز فقہی تحقیقات کا حال معلوم ہوتا ہے، وہاں مصنف کے تحقیقی شعور کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ امام احمد رضا قدس سرہ کی گراں قدر تصانیف کی سب سے بڑی علمی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں دلائل و جزئیات کی کثرت، مختلف اقوال میں تطبیق، حلِّ اشکالات، متقدمین و معاصرین کے تسامحات کی نشان دہی، لغزش و خطا پر تنبیہ اور غیر منصوص احکام کا اِستنباط و استخراج ہے۔ فاضل مصنف نے اس حوالے سے تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور دلائل و شواہد کے ساتھ اپنے موقف کے تمام پہلوؤں کو منقح کیا ہے۔ کتاب کے مشمولات و مندرجات یہ ہیں:

(۱) مشکلات و مبہمات کی توضیح (۲) مختلف اقوال میں ترجیح (۳) کثیر جزئیات کی فراہمی (۴) مراجع اور حوالوں کی کثرت (۵) اعلیٰ حضرت کی فکر انگیز تحقیقات (۶) غیر منصوص احکام کا استنباط اور جدید مسائل کی تحقیق (۷) تخریجِ احادیث (۸) علمِ حدیث میں کمال اور قوتِ استنباط و استخراج (۹) علمِ کلام میں مہارت (۱۰) علمِ تاریخ میں مہارت (۱۱) مخالفین و

موافقین پر تعاقبات (۱۲) تطفلات - سہو و خطا پر تنبیہات - (۱۳) دنیاوی معاملات سے آگاہی۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان قدس سرہ کی ذاتِ گرامی "بحر العلوم و جامعِ الفنون" کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی تصانیف میں علوم و فنون اور تحقیقات و تنقیحات کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر نظر آتا ہے۔ وہ سائل کے نفسِ سوال کا شرعی جواب دیتے ہوئے بسا اوقات ایسی نفیس تحقیقی مباحث سپردِ قرطاس فرماتے ہیں کہ عقلیں دنگ رہ جاتی ہیں۔ فتاویٰ رضویہ، جلدِ اول، کتاب الطہارۃ کے باب التیمم میں "پانی" کے انواع و اقسام پر جو تحقیقی افادات رقم فرمائے ہیں، فقہ و افتا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آپ نے اس مقام پر ایک سو اکیاسی (۱۸۱) ایسی چیزوں کے نام گنوائے ہیں، جن سے تیمم جائز ہے اور ایک سو تیس (۱۳۰) ایسی اشیا کے نام تحریر کیے ہیں، جن سے تیمم کرنا جائز نہیں ہے۔ مائے مستعمل و غیر مستعمل (یعنی وہ پانی جس سے وضو کرنا جائز ہے اور جس سے وضو ناجائز ہے) پر بحث کرتے ہوئے ایسے پانی کی ایک سو ساٹھ (۱۶۰) قسمیں بیان کی ہیں، جن سے وضو کرنا جائز ہے اور وہ پانی جس سے وضو جائز نہیں، اس کی ایک سو چھیالیس (۱۴۶) اقسام بیان فرمائی ہیں۔ اللہ اکبر! اس کو کہتے ہیں علم و تحقیق کا دریا بہانا۔

فاضل مصنف حضرت مفتی محمد رضا قادری مصباحی دام ظلہ العالی نے زیرِ تبصرہ کتاب میں "امام احمد رضا کی فکر انگیز تحقیقات" کے تحت بڑی مدلل گفتگو فرمائی ہے اور فقہ و افتا کے ایک عظیم محقق کی حیثیت سے امام موصوف کی فقہی تحقیقات پر روشنی ڈالتے ہوئے ولایتِ مجبرہ کی تمام قسموں کی مکمل توضیح و تحقیق / کافر، مسلمان کا ولی اور قاضی نہیں ہو سکتا / سود سے بچنے کے لیے حیلۂ شرعی کا جواز / بیع عینہ کی تحقیق اور اس کا شرعی حکم / جیسے گراں قدر فقہی مباحث سے اپنے قارئین کو جہانِ تحقیقاتِ رضا کی سیر کرائی ہے۔

"غیر منصوص احکام کا استنباط اور جدید مسائل کی تحقیق" میں امام احمد رضا قدس سرہ کو درک و کمال حاصل تھا۔ فتاویٰ رضویہ میں بہت سارے ایسے تحقیقی مسائل موجود ہیں، جن

کی صراحت و اشارت فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں موجود نہیں ہے ۔ انہیں میں سے ایک اہم اور اس زمانے کا لاینحل مسئلہ "کرنسی نوٹ" کا بھی ہے ۔ مفتیِ اعظم مکہ مکرمہ حضرت شیخ جمال بن عبداللہ حنفی علیہ الرحمہ سے جب کرنسی نوٹ کی بابت سوال ہوا تو آپ یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ "العلم امانۃ فی اعناق العلماء، واللہ اعلم" لیکن قربان جائیے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کے علمی تبحر پر کہ جب آپ سے اس کے بارے میں سوال ہوا تو آپ نے اس کی حقیقت و ماہیت اور شرعی حکم بیان فرماتے ہوئے وہ تحقیق پیش فرمائی کہ طبیعت جھوم اٹھتی ہے ۔ بقولِ مصنف: کرنسی نوٹ کا مسئلہ اس زمانے میں کس قدر لاینحل ہو چکا تھا، اس کا اندازہ مفتیِ اعظم مکہ مکرمہ شیخ جمال بن عبداللہ بن عمر حنفی کے جواب سے لگایا جا سکتا ہے ۔ مگر اعلیٰ حضرت نے اپنی خداداد فقہی بصیرت سے اس کا ایسا حل تلاش فرمایا کہ علمائے عرب و عجم سب حیرت میں پڑ گئے اور قارئین عش عش کر اٹھے ۔ ان تحقیقات کی چند جھلکیاں آپ بھی ملاحظہ کریں ۔ (تفصیل کے لیے زیر نظر کتاب کا مطالعہ کریں)

امام احمد رضا محدث بریلوی کے فقہی کمالات کا یہ روشن پہلو بھی قابلِ ذکر ہے کہ انہیں مشکلات و مبہمات کی توضیح اور مختلف اقوال میں ترجیح کا زبردست ملکہ حاصل تھا ۔ مصنف اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

پیچیدہ مقامات کی توضیح و تشریح اور مشکلات و مبہمات کی تنقیح و تبیین کا کام کتنا اہم، دقت نظر اور وسعتِ مطالعہ کا متقاضی ہے، وہ اہلِ فہم پر مخفی نہیں ۔ امام احمد رضا قدس سرہ نے اس مشقت خیز امر کو کمال مہارت کے ساتھ سر فرمایا ہے ۔ فقہائے سلف کے کلام میں جہاں خفا و ابہام رہ گیا، انہوں نے ان کو روشن فرمایا اور جن دقیق نکات کی طرف صراحتاً ان کی توجہ نہیں ہو سکی تھی، ان کی طرف لطیف اشارہ بھی فرمایا ۔ اس ضمن میں بیشمار مثالیں آپ کے فتاویٰ میں موجود ہیں ۔ یہاں پر چند شواہد فتاویٰ رضویہ، جلدِ ہفتم سے نذرِ قارئین ہیں ....(تفصیل کے لیے زیر نظر کتاب کی جانب رجوع کریں)

مختلف اقوال میں ترجیح بڑا اہم کام ہے، جسے اجلۂ فقہا نے اپنی فقاہت اور وسعتِ علم کے

سہارے بڑی عالی ہمتی سے انجام دیا۔ لیکن جہاں ان سے کوئی ترجیح منقول نہ ہو یا جہاں مختلف تصحیح و ترجیح منقول ہوں، وہاں یہ کام اور زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر یہاں بھی اعلیٰ حضرت کا قلمِ حق رقم اور دقتِ نظر لائقِ خراجِ تحسین ہے کہ اس دشوار ترین مرحلے کو بھی کامیابی کے ساتھ سر فرمایا ہے۔ ذیل کی سطور میں چند شواہد نذرِ قارئین ہیں۔

(امام احمد رضا کا فقہی کمال، ص:۷ / ۱۴)

فتویٰ نویسی نہایت دشوار اور ایک ذمہ دارانہ عمل ہے۔ اس کے لیے مفتی کو دقاق عالم اور مختلف دینی علوم کا ماہر ہونے کے علاوہ حساس، ذی شعور، عرف و عادت سے واقف اور زمانہ شناس ہونا ضروری ہے۔ فاضل مصنف نے "دنیاوی معاملات سے آگاہی" کے عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے اور دلائل کی روشنی میں امام احمد رضا قدس سرہ کے فکر و فن کا عالمانہ و محققانہ جائزہ لیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

ایک مفتی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ دنیاوی معاملات، لوگوں کے عرف و عادات اور لین دین کے طور طریقوں سے باخبر ہو۔ حالاتِ زمانہ پر ان کی نگاہ ہو۔ اس زاویے سے اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی زندگی کا جب مطالعہ کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر دینی مشاغل کی کثرت اور ہجومِ کار کے باوجود رفتارِ زمانہ اور معاملاتِ دنیوی پر گہری نگاہ اور عقابی نظر رکھتے ہیں۔

(ایضاً، ص:۱۴۳)

اسی طرح تخریجِ احادیث میں اعلیٰ حضرت کا محدثانہ مقام، علمِ کلام و علمِ تاریخ میں آپ کی حذاقت و مہارت اور مخالفین و موافقین پر آپ کے تعاقبات و تطفلات جیسے اہم، دلچسپ اور قیمتی موضوعات پر مصنف نے بیش قیمت مواد اس کتاب میں جمع کر دیے ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ راقم الحروف اس گراں قدر تالیف پر انہیں مبارک باد پیش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر سے نوازے اور ان کی توفیقات میں دن بدن اضافہ فرمائے آمین۔

تبصرہ نگار:

طفیل احمد مصباحی

سابق ایڈیٹر ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور

۷/اپریل ۲۰۲۱ء، بروز چہار شنبہ

تقدیم

از مصنف

ولادت: بریلی کے وہ فرزند نجیب جس کے والد امام المتکلّمین، دادا امام المتّقین، بیٹے حجۃ الاسلام اور مفتی اعظم ہند، جد امجد نے جس کا تاریخی نام "المختار" اور عرفی نام احمد رضا رکھا ۱۰ر شوال المکرم ۱۴ر جون ۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۶ء کو رونق افزاے عالم ہوئے۔[1]

یہ وہ وقت تھا کہ ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا ساتین سو سالہ خورشید اقبال ڈوب رہا تھا، سیاسی بازی گروں کی کش مکش سے سارا کشور ہند لرزاٹھا تھا اور انگریز بساط ہند پر اپنے اقتدار کا پرچم نصب کر چکے تھے۔

تعلیم: جد امجد حضرت مولانا رضا علی خان (ولادت ۱۲۲۴ھ وفات ۱۲۸۶ھ) جو صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے انھوں نے عقیقہ کے دن ایک خوشگوار خواب دیکھا جس کی تعبیر یہ تھی کی یہ فرزند فاضل و عارف ہوگا۔ طفولیت کے زمانے میں بسم اللہ خوانی ہوئی اور چار سال کی عمر میں ناظرہ قرآن مجید ختم کیا۔ آٹھ سال کی عمر میں ہدایۃ النحو کی عربی شرح لکھی۔ دس سال کی عمر میں مسلم الثبوت جیسی ادق کتاب پر حاشیہ قلمبند فرمایا اور ۱۳ تیرہ سال دس مہینہ کی عمر میں ۱۴ر شعبان ۱۲۸۶ھ میں تمام درسیات سے فراغت حاصل فرمائی۔ ابتدائی تعلیم میزان و منشعب و غیرہما مرزا غلام قادر بیگ سے پڑھی شرح چغمینی کے چند اسباق مولانا عبدالعلی رامپوری سے حاصل کیے اور بقیہ دینیات معقولہ و منقولہ کی تکمیل اپنے والد ماجد خاتم المحققین حضرت مولانا نقی علی خان قادری ۱۲۴۶ھ / ۱۲۹۷ھ سے فرمائی۔[2]

---

(۱) حیات اعلی حضرت از ملک العلماء سید ظفر الدین بہاری ار ۱۰۲ مطبوعہ مرکز اہلسنت برکات رضا پور بندر گجرات ۲۰۰۳ء

(۲) حیات اعلی حضرت از ملک العلماء سید ظفر الدین بہاری ار ۱۱۵-۱۱۴ مطبوعہ مرکز اہلسنت برکات رضا پور بندر گجرات ۲۰۰۳ء

اوائل عمر ہی سے ہوشمندی، ذکاوت وفطانت اور بلندی کے آثار آپ کی پیشانی پر ہویدا تھے۔ رسم بسم اللہ خوانی کے وقت جو حیرت انگیز واقعہ پیش آیا اسے سن کر سعدی شیرازی کا یہ شعر بے ساختہ ہونٹوں پہ مچل جاتا ہے۔

بالائے سرش زہوش مندی　　　　می تافت ستارۂ بلندی

بیعت وخلافت: ۱۲۹۴ھ میں خاتم الاکابر حضرت سید شاہ آل رسول احمدی مارہروی قدس سرہ سے بیعت فرمائی اور تمام سلاسل قدیمہ وجدیدہ کی خلافت واجازت کے ساتھ سند حدیث کی اجازت سے بھی مشرف ہوئے۔[1]

حج وزیارت: ۱۲۹۵ھ میں پہلی بار والد ماجد کے ساتھ زیارت حرمین طیبین کی سعادت حاصل کی۔ اور اکابر علمائے عرب حضرت سید احمد بن زینی دحلان مکی مفتی شافعیہ، حضرت عبد الرحمن سراج مفتی حنفیہ اور شیخ حسین بن صالح جمل اللیل امام شافعیہ وغیرہم سے علمی استفادہ فرمایا۔ اور ان بزرگوں نے فقہ وحدیث کی اجازت عطا فرمائی۔ اس سفر میں ایک روز مغرب کی نماز اعلیٰ حضرت نے مقام ابراہیم پر ادا کی، بعد نماز امام شافعیہ شیخ حسین بن صالح جمل اللیل نے بلا سابق تعارف کے آپ کا ہاتھ پکڑا اور اپنے ساتھ لیتے ہوئے دولت کدے پر تشریف لے گئے اور دیر تک آپ کی پیشانی کو پکڑ کر فرمایا: إِنّی لأَجِدُ نُوْرَ اللهِ فِی هٰذا الْجَبِیْنِ بیشک میں اس پیشانی میں اللہ کا نور پاتا ہوں۔ اور اپنے دست مبارک سے سلسلۂ قادریہ کی اجازت لکھ کر عنایت کی اور فرمایا: تمھارا نام ''ضیاء الدین احمد'' ہے۔ اس سند کی خوبی یہ ہے کہ اس میں امام بخاری تک صرف گیارہ واسطے ہیں۔[2]

قوت حافظہ: اعلیٰ حضرت قدس سرہ کو اللہ تعالیٰ نے حیرت انگیز قوتِ حفظ سے نوازا تھا۔ اس کا اندازہ ذیل کے دو واقعات سے لگایا جاسکتا ہے۔

---

(۱) حیات اعلیٰ حضرت از ملک العلماء سید ظفر الدین بہاری ۱/۱۱۴ مطبوعہ مرکز اہلسنت برکات رضا پور بندر گجرات ۲۰۰۳ء

(۲) حیات اعلیٰ حضرت از ملک العلماء سید ظفر الدین بہاری ۱/۱۳۳ مطبوعہ مرکز اہلسنت برکات رضا پور بندر گجرات ۲۰۰۳ء

(۱) سید ایوب علی رضوی کا بیان ہے کہ اعلی حضرت قُدِّسَ سِرُّہٗ نے ایک دن ارشاد فرمایا کہ بعض ناواقف حضرات میرے نام کے ساتھ حافظ لکھدیا کرتے ہیں حالانکہ میں اس لقب کا اہل نہیں ہوں۔ اس دن سے آپ نے قرآن مجید کے حفظ کی طرف توجہ فرمائی اور تیس دنوں میں تیس پارے قرآن پاک حفظ فرما کر تراویح میں سنا دیے۔ ایسا بھی نہیں کہ پورا دن یاد کرنے میں لگا دیتے ہوں بلکہ ہر روز ایک پارہ عشاء کا وضو فرمانے کے بعد سے جماعت قائم ہونے تک یاد فر ما لیتے۔[(۱)]

(۲) ایک بار پیلی بھیت میں حضرت مولانا وصی احمد محدث سورتی کے یہاں مہمان ہوئے اثنائے گفتگو ''عقود الدریہ فی تنقیح الفتاوٰی الحامدیۃ'' کا ذکر چل پڑا محدث سورتی صاحب نے فرمایا: میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ اعلی حضرت نے فرمایا میں نے دیکھی نہیں ہے جاتے وقت میرے ساتھ کر دیجئے گا۔ محدث سورتی نے بخوشی قبول کیا اور کتاب لاکر حاضر کر دی۔ دو ضخیم جلدوں پر مشتمل اس کتاب کو آپ نے رات اور دن کے کچھ حصے میں پورا مطالعہ فرما لیا۔ جب روانگی کا وقت ہوا تو اعلی حضرت نے کتاب اندر بھیجوا دی اور ساتھ نہ لیا۔ محدث صاحب کتاب کے ساتھ واپس ہوئے اور عرض گزار ہوئے: کیا میں نے یہ کہہ دیا تھا کہ مطالعہ کے بعد واپس کر دیں گے اس لیے آپ ناراض ہو گئے اور کتاب ساتھ نہ لیا؟ آپ نے فرمایا کل میں جاتا تو ساتھ لے جاتا ٹھہرنے کی وجہ سے میں نے رات میں اور صبح میں پورا مطالعہ کر لیا ہے اب لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ انہوں نے ازراہ تعجب پوچھ دیا بس ایک مرتبہ دیکھ لینا کافی ہو گیا؟ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے امید ہے کہ دو تین مہینہ تک جہاں کی عبارت کی ضرورت ہو گی فتاویٰ میں لکھ دوں گا اور مضمون تو ان شاء اللہ عمر بھر کے لیے محفوظ ہو گیا ہے۔[(۲)]

---

(۱) حیات اعلیٰ حضرت از ملک العلماء سید ظفر الدین بہاری ۱/ ۲۵۲ مطبوعہ مرکز اہلسنت برکات رضا پوربندر گجرات ۲۰۰۳ء

(۲) حیات اعلیٰ حضرت از ملک العلماء سید ظفر الدین بہاری ۱/ ۲۵۷ مطبوعہ مرکز اہلسنت برکات رضا

تصنیف و تالیف: اعلیٰ حضرت قدس سرہ کو مروجہ تمام علوم و فنون پر کامل دسترس حاصل تھا۔ پچاس سے زائد علوم میں آپ نے کتابیں اور رسائل تصنیف فرمائے جن کی تعداد چھ سو سے زیادہ ہے [۱] یوں تو تمام علوم و فنون مروجہ پر آپ کو دسترس حاصل تھی لیکن فقہ و فتاویٰ و حدیث میں آپ کا مقام سب سے بلند تھا، بلکہ آپ اپنے دور کے ثانیِ امام اعظم ابو حنیفہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ کتب حرم سید محمد اسماعیل بن خلیل مکی نے اپنے ایک مکتوب میں اعلیٰ حضرت اور ان کے فتاویٰ سے متعلق تحریر فرمایا لَورَاٰهَا أبوحنيفة النُّعْمَانُ لَأَقَرَّتْ عَيْنَيْهِ وَ لَجَعَلَ مؤ لِّفَهَا مِنْ جُمْلَةِ الْأَصْحَابِ۔ [۲]

اگر امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت ان فتاویٰ کو دیکھ لیتے تو ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتیں اور ان فتاویٰ کے مؤلف کو اپنے اصحاب (امام ابو یوسف و محمد وغیرہما رحمہما اللہ) کے زمرے میں شامل فرما لیتے۔ فتاویٰ رضویہ کی بارہ ضخیم جلدیں اس پر شاہد ہیں۔ اس میں آپ نے تحقیق و تدقیق کے وہ دریا بہائے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے علم کا ایک چشمۂ سیال ہے جو بند ہونے کا نام نہیں لیتا۔ رد المحتار علامہ شامی پر پانچ جلدوں میں حاشیہ تحریر فرمایا۔ جب وہابیوں نے علم غیب مصطفیٰ ﷺ کے خلاف سورش برپا کی تو آٹھ گھنٹے کی قلیل مدت میں اَلدَّولَۃ المکیّۃ بالمادّۃِ الغیبیّۃ نامی کتاب تصنیف فرما کر ان کے ناپاک عزائم کو خاک آلود کر دیا۔

فقہی تبحّر: امام احمد رضا قادری اپنے دور کے ایک عبقری اور نابغۂ روزگار فقیہ تھے۔ فقہ کو انھوں نے اپنا سرمایۂ حیات بنا لیا تھا اور پوری زندگی اس علم کی خدمت میں صرف فرما دی۔ فقہ حنفی کو استدلال کی زبان عطا کی۔ وہ لوگ جو یہ کہتے ہوئے نظر آتے تھے کہ فقہ حنفی محض قیاس اور آرائے فقہا کا مجموعہ ہے اس کی زمینی حیثیت کچھ بھی نہیں، حدیث سے کوئی واسطہ نہیں ہے ان کی

پور بندر گجرات ۲۰۰۳ء

(۱) حیات اعلیٰ حضرت از ملک العلماء سید ظفر الدین بہاری ۱/۲۵۷ مطبوعہ مرکز اہلسنت برکات رضا پور بندر گجرات ۲۰۰۳ء

(۲) حیات اعلیٰ حضرت از ملک العلماء ۱/۱۰۱ مطبوعہ مکتبہ نبویہ گنج بخش روڈ لاہور ۲۰۰۳ء

زبانوں کو ہمیشہ کی لیے بند کر دیا اور واضح کر دیا ہے کہ امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو مسائل مستنبط کیے ہیں وہ سب کتاب و سنت اور اجماع امت کی روشنی میں ہیں اور ہزاروں مقامات پر استدلال کرتے ہوئے ثابت کر دیا کہ اس مسئلہ میں امام اعظم کی دلیل یہ حدیث ہے اور فلاں مسئلہ میں یہ۔ استنباطِ مسائل میں امام اعظم ابو حنیفہ کی نگاہ ان مصادرِ شریعت پر ہوا کرتی تھی جہاں بڑے بڑے ائمۂ مجتہدین کی نگاہیں پہنچنے سے قاصر رہیں۔ اور عدمِ رسائی کی بنیاد پر ان کے استنباط کردہ مسائل کو قیاسی مسائل کے زمرے میں شامل کر دیا۔

علماے اصول نے مجتہدین کے تین طبقات کا ذکر کیا ہے۔ پہلا طبقہ مجتہدین فی الشرع کا ہے۔ یہ اصول و فروع میں کسی امام کے مقلد نہیں ہوتے ہیں بلکہ براہ راست کتاب و سنت سے استنباطِ احکام کرتے ہیں جیسے ائمۂ اربعہ وغیرہم۔ دوسرا طبقہ مجتہدین فی المذہب کا ہے جو اصل میں اپنے امام کے پابند ہوتے ہیں جیسے صاحبین وغیرہما۔ تیسرا طبقہ مجتہدین فی المسائل کا ہے جو اصول و فروع میں اپنے امام کے پابند ہیں اور امام مذہب سے جو مسائل منصوص نہیں ہیں ان غیر منصوص مسائل کے احکام کا استنباط کرنے کی قدرت رکھتے ہیں جیسے امام کرخی و طحاوی و بزدوی وغیرہم۔ امام احمد رضا قُدِّسَ سِرہ کے فتاویٰ اور تحقیقات انیقہ کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت روز رروشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ وہ مجتہدین کے اس تیسرے طبقہ میں شامل ہیں۔

چنانچہ انگریزوں کی ایک کمپنی "روسر" جانوروں کی ہڈیاں جلا کر ان کی راکھ سے شکر صاف کرتی تھی، جس میں حلال و حرام جانور کی ہڈیوں کی تمیز نہیں تھی۔ یہ ایک نیا مسئلہ تھا جسے آپ نے اُصولِ دینیہ کی روشنی میں تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا۔

جنسِ ارض کی اقسام: اسی طرح جنسِ ارض کی چوہتر (۷۴) قسمیں علماے متقدمین نے بیان کی تھیں جن سے تیمم جائز ہے ان میں آپ نے ایک سو سات چیزوں کا اضافہ فرمایا اور جن چیزوں سے تیمم نہیں ہو سکتا تھا فقہاے متقدمین نے اٹھاون ۵۸ چیزیں گنوائی تھیں جب کہ آپ نے ان میں بہتر ۷۲ چیزوں کا اضافہ فرمایا۔ یہ کل تین سو گیارہ (۳۱۱) چیزیں ہوتی ہیں ان میں

۱۸۱ سے تیمم جائز ہے اور ۱۳۰ سے ناجائز ہے۔ پھر زیادات کے بارے میں فرمایا: ایسا جامع بیان اس تحریر کے غیر میں نہ ملے گا بلکہ زیادات در کنار اتنے منصوصات کا استخراج بھی سہل نہ ہو سکے گا وللہ الحمد۔ (۱)

کرنسی نوٹ کا حکم: اسی طرح کرنسی نوٹ ایک نوپید اور حادث چیز تھی فقہائے متقدمین و متاخرین کی کتابوں میں کہیں اس کی صراحت نہیں تھی جب دوسری بار اعلیٰ حضرت قدس سرہ ۱۳۲۳ھ میں حج و زیارت کے لیے تشریف لے گئے تو مکہ مکرمہ کے دو اکابر عالم دین مولانا عبداللہ مرداد اور فاضل جلیل حامد احمد محمد جدّاوی نے نوٹ کے احکام سے متعلق ۱۲ بارہ سوالات پیش فرمائے، اعلیٰ حضرت قُدِّسَ سِرّہ نے بکمالِ استعجال نوٹ کے احکام سے متعلق ایک مبسوط رسالہ کِفْلُ الْفَقِیْهِ الْفَا هِم فِی اَحْکَامِ قِرْطَاسِ الدَّرَاهِمِ صرف ڈیڑھ دن کی قلیل مدت میں تصنیف فرما کر علمائے عرب و عجم کو خوشگوار حیرت میں مبتلا کر دیا۔ اور دلائلِ ساطعہ باہرہ ظاہرہ سے اس کا مال ہونا ثابت فرمایا، اس رسالہ کو پڑھنے کے بعد علمائے عرب کی آنکھیں فرطِ مسرت سے چمک اٹھیں گویا انھیں کوئی مخفی خزانہ ہاتھ آگیا ہو۔

اس سے قبل اعلیٰ حضرت کے استاذ الاستاذ حضرت شیخ جمال بن عبداللہ بن عمر سابق مفتی حنفیہ مکہ سے بھی نوٹ کے متعلق سوال ہوا تھا تو انھوں نے صرف اس قدر جواب پر اکتفا فرمایا "اَلْعِلْمُ أَمَانَةٌ فِیْ أَعْنَاقِ الْعُلَمَاءِ وَاللّٰهُ تعالیٰ أَعْلَمُ"۔ علم علما کی گردنوں میں امانت ہے۔ مجھے اس کے جزیہ کا کوئی پتہ نہیں چلتا کہ کچھ حکم دوں۔ مکہ معظمہ کے ایک جلیل الشان عالم دین نے جب مذکورہ رسالے کا مطالعہ کیا اور اس مقام پر پہنچے جہاں اعلیٰ حضرت نے فتح القدیر سے یہ جزئیہ نقل فرمایا تھا "لَوْ بَاعَ كَاغِذَةً بِأَلْف یَجُوْزُ وَلَا یُكْرَه" پھڑک اٹھے اور اپنے ران پر ہاتھ مارتے ہوئے بولے: اَینَ جَمَالُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ مِنْ هٰذَا النَّصِّ الصرِیْح (۲) حضرت جمال بن عبداللہ اس نص صریح سے کہاں غافل رہے؟ مذکورہ رسالہ فتاویٰ رضویہ جلد ہفتم میں

(۱) الاجازت المتنیہ لعلماء مکۃ والمدینۃ ص ۳۵۹ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء
(۲) فتاوی رضویہ ۱/۱۰۷ باب التیمم

ملاحظہ فرمائیں۔ ان کے علاوہ اور بھی سینکڑوں مسائل ہیں جن کے احکام کا استخراج اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے اصول فقہ اور جزئیات فقہ کی روشنی میں فرمایا ہے۔

مختلف اقوال میں تطبیق و توضیح: مشکلات و مبہمات کی تنقیح و تبیین، مختلف اقوال میں صحیح تطبیق اور ان سب کا ایسا معنی بیان کر دینا جس سے اختلاف ہی ختم ہو جائے اور سب مناسب صورتوں پر منطبق ہو جائیں یہ بڑی مہارت اور وسعتِ نظر کا متقاضی ہے مگر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کی تصانیف اور فکر انگیز تحقیقات میں بکثرت اس مہارت کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ درج بالا عنوان کے تحت چند شواہد ذیل کی سطور میں ملاحظہ کریں۔

اِسراف فی الماء کا حکم: (۱) اعلیٰ حضرت قدس سرہ سے ایک سول ہوا کہ طہارت میں بلا ضرورت پانی زیادہ صرف کرنے کا کیا حکم ہے؟

آپ نے فرمایا: اس بارے میں علمائے کرام سے چار طرح کے اقوال منقول ہیں۔ اول: یہ کہ مطلقاً ناجائز اور حرام ہے یہ قول بعض شوافع حضرات کا ہے جسے خود شیخ مذہب شافعی علامہ نو وی اور دوسرے محققین شافعیہ نے ضعیف فرمایا۔ دوم: مکروہ تنزیہی، خواہ بہتے ہوئے دریا میں ہو یا گھر میں حِلیہ اور بحر الرائق میں اسی کو اوجہ، اور نووی نے اظہر اور دوسرے ائمہ نے صحیح کہا ہے۔ سوم: مطلقاً کراہت نہیں، نہ تنزیہی نہ تحریمی، صرف ادب اور امر مستحب کے خلاف ہے، بدائع، فتح القدیر، منیۃ المصلی غُنیّہ، منیہ، خلاصۃ الفتاوٰی اور ہندیہ وغیرھا کتب میں ترک اِسراف کو آداب و مستحباتِ وضو سے شمار کیا گیا ہے اور مستحب کا ترک مکروہ نہیں بلکہ سنت کا ترک مکروہ ہے۔ چہارم: نہرِ جاری میں اِسراف جائز ہے کہ پانی کا ضِیاع نہیں ہوتا ہے اور اس کے علاوہ میں مکروہ تحریمی، مدقق علائی نے در مختار میں اسی کو مختار کہا، عمر بن نجیم نے نہر الفائق میں کراہت تحریم ہی کو ظاہر کہا اور اسی کو امام قاضی خان اور شمس الائمہ حلوائی وغیرھما اکابر کے کلام کا مفاد قرار دیا۔[1]

مذکورہ بالا چاروں اقوال میں بظاہر شدید اختلاف اور تعارض معلوم ہوتا ہے اور ایک عام

(۱) حیات اعلیٰ حضرت از ملک العلماء ار ۲۴۳ مطبع پوربندر

مفتی کے لئے یہ فیصلہ نہایت مشکل ہے کہ وہ اِسراف فی الماء کے بارے میں کون سا حکم صادر کرے مگر اعلیٰ حضرت قدّس سرّہٗ نے اس کمال مہارت کے ساتھ اس مشکل مقام کی توضیح اور مختلف اقوال میں تطبیق ظاہر فرمائی کہ سرے سے اختلاف ہی باقی نہ رہا۔ پہلے آپ نے ان تمام احکام کے علاحدہ علاحدہ محل کا تعین فرمایا پھر بعض احکام کو بعض صورتوں پر منطبق فرمایا۔ ان کے تطبیق کا خلاصہ یہ ہے:

حرام: بلاضرورت سنت سمجھ کر پانی زیادہ صرف کرنا اگرچہ دریا میں ہو۔

مکروہ تحریمی: بلا اعتقاد سُنت و بلاضرورت پانی اس طرح صرف کرنا کہ وہ ضائع ہو جائے۔

مکروہ تنزیہی: نہ سُنیّت کا اعتقاد ہو نہ پانی ضائع کرنے کا ارادہ لیکن عادۃً بلاضرورت پانی صرف ہو جائے۔

خلافِ ادب: سنیت کا اعتقاد ہو نہ پانی ضائع کرنے کا اردہ، نادراً بلاضرورت پانی صرف ہو عادی طور پر نہ ہو اس بصیرت افروز تطبیق کے بعد یوں رقم طراز ہوئے: یہ ہے بحمداللہ فقہِ جامع و فکرِ نافع و درکِ بالغ و نورِ بازغ و کمالِ توفیق و جمالِ تطبیق و حُسنِ تحقیق و عِطرِ تدقیق و باللہ التوفیق والحمدللہ رب العالمین الخ۔ (۱)

اس سے اعلیٰ حضرت کی ژرف نگاہی اور فقہی تبحر کا اندازہ ہوتا ہے واضح ہو کہ یہ تطبیق یوں ہی نہیں دے دی بلکہ پہلے ہر قول کے ماخذ کا جائزہ لیا پھر اصولِ فقہ کی روشنی میں تطبیق کی راہ نکالی اور فقہا کے اقوال سے مؤید و مبرہن فرمایا۔ اس مسئلے کی پوری تفصیل و تحقیق رسالہ ”برکات السماء فی حکمِ اِسراف الماء“ (۱۳۲۷ھ) فتاوی رضویہ جلد اول میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) افضلیتِ سیّد الانبیاء اور افضلیتِ قرآن کا مسئلہ

دُرِّ مُختار باب المیاہ سے ذرا پہلے یہ مسئلہ مذکور ہے۔ وَمَحْوُ بَعْضِ الْكِتَابَةِ بِالرِّيْقِ يَجُوْزُ وَ قَدْ وَرَدَ النَهْىُ فِى مَحْوِ اسمِ الله بالبُزاقِ و عنه عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ والسَّلامُ: القُرآنُ أَحَبُّ إِلى الله تَعالى مِنَ السَّماوات وَالأرضِ وَ مَنْ فِيْهِنَّ.

---

(۱) فتاوی رضویہ ج۱ ص۷۶۱ باب الغسل مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی

کسی تحریر کو تھوک سے مٹانا جائز ہے البتہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا نام تھوک سے مٹانے کے بارے میں ممانعت آئی ہے۔ اور نبی ﷺ سے مروی ہے: قرآن اللہ کے نزدیک آسمانوں اور زمینوں اور ان سب سے افضل ہے جو آسمانوں میں اور زمینوں میں ہیں۔ اس حدیث میں قرآن کو آسمانوں اور ان میں بسنے والے سب لوگوں سے افضل بتا یا گیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہو تا ہے کہ کیا قرآن سید الانبیاء ﷺ سے بھی افضل ہے یا نہیں! بعض علما اثبات کے قائل ہیں اور بعض نفی کے۔ اب اس پر علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کا جواب ملاحظہ فرمائیں آپ لکھتے ہیں: ظَاهِرُه يَعُمُّ النَّبِيَ ﷺ وَالْمَسْئَلَةُ ذَاتُ خِلَاف وَالأَحْوَطُ التوَقُّفُ[1] ظاہر حدیث سے تو یہی معلوم ہو تا ہے کہ قرآن حضور ﷺ سے بھی افضل ہے مگر زیادہ احتیاط یہ ہے کہ توقف کیا جائے۔

متأخرین فقہا میں علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ کا کتنا بلند مقام ہے وہ اہل علم پر مخفی نہیں، مسئلہ کی نزاکت کے پیش نظر آپ نے توقف کی راہ اختیار فرمائی مگر امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ نے جدُّ الممتار میں "والأَحوَطُ التَّوَقُّفُ" کے تحت تحریر فرمایا: لَا حَاجَةَ إِلَى التَوَقُّفِ وَالْمَسْئَلَةُ وَاضِحَةُ الْحُكْمِ عِنْدِي بِتَوْفِيْقِ اللهِ تَعَالىٰ فَإِنَّ الْقُرْآنَ إِنْ أُرِيْدَ بِه الْمُصْحَفُ أَعْنِى الْقِرْطَاسَ وَالْمِدَادَ فَلَاشَكَّ أَنَّهُ حَادِثٌ وَ كُلُّ حَادِث مَخْلُوْقٌ فَالنَّبِيُّ ﷺ أَفْضَلُ مِنه، وَإِنْ أُرِيْدَ بِه كَلَامُ اللهِ تَعَالىٰ الذى هِيَ صِفَتُهُ فَلَاشَكَّ أَنَّ صِفَاتِه تَعَالىٰ أَفْضَلُ مِنْ جَمِيْعِ الْمَخْلُوْقَاتِ فَكَيْفَ يُسَاوِىْ غَيْرُه، مَا لَيْسَ بِغَيْرِه تَعَالىٰ ذِكْرُه وَبِه يَكُوْنُ التَّوْفِيقُ بَيْنَ الْقَوْلَينِ[2] توقف کی کوئی ضرورت نہیں میرے نزدیک اللہ کی توفیق سے مسئلہ کا حکم واضح ہے اس لیے کہ قرآن سے اگر مصحف یعنی کاغذ اور روشنائی مراد ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ حادث ہے اور ہر حادث مخلوق ہے اور جو بھی مخلوق ہے نبی کریم ﷺ اس سے افضل ہیں اور اگر قرآن سے مراد کلام الٰہی ہے جو باری تعالیٰ کی صفت ہے (یعنی کلام نفسی) تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صفات باری تعالیٰ جمیع مخلوقات سے افضل ہیں۔ اور مخلوق جو غیر خدا ہے بھلا اس کے (صفت) برابر کیوں کر ہو سکتا ہے جو غیر ذات نہیں اس کا ذکر بلند ہو ہماری اس توجیہ سے دو مختلف اقوال میں تطبیق ہو جاتی ہے۔

---

(۱) فتاوی رضویہ ج اول ص ۲۰۷ باب الغسل

(۲) جد الممتار علی رد المحتار ۱/ ۱۲۰۔ ۱۱۹ کتاب الطہارۃ، مطبوعہ المجمع الاسلامی مبارکپور اعظم گڑھ ۱۹۸۲ء

یعنی جن علما نے کہا: کہ قرآن افضل ہے ان کی مراد قرآن سے صفت الٰہی قدیم ہے جو بلا شبہ تمام مخلوقات سے افضل ہے اور جن علما نے نبی کریم ﷺ کو قرآن سے افضل بتایا انہوں نے قرآن سے مصحف مراد لیا، جو کاغذ اور روشنائی کا مجموعہ ہے۔ یقیناً سید عالم ﷺ اس سے افضل ہیں۔ یہ ہے امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی فقاہت فی الدین اور دِقّتِ نظر کہ اس لاینحل مسئلہ کا حل بھی پیش فرمایا اور اور دو مختلف اقوال میں خوبصورت تطبیق بھی پیش فرمائی۔

ایک صاع پانی سے غسل اور ایک مُد پانی سے وضو کا مسئلہ

صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کونین ﷺ ایک صاع سے لے کر پانچ مد تک پانی سے غسل اور ایک مد سے وضو فرما لیا کرتے تھے رواہ مسلم واحمد والترمذی، ابن ماجہ و الطحاوی عن سفینہ۔ دوسری روایت حضرت ابو عمامہ باہلی رضی اللہ عنہ کی ہے کہ حضور ﷺ نے نصف مد سے وضو فرمایا اس حدیث کو ابو یعلیٰ، طبرانی اور بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ابو دائود و نسائی کی حدیث میں جس کو انہوں نے ام عمارہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے دو تہائی مد کا ذکر ہے ابن خزیمہ اور ابن حبان کی صحیح میں عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی روایت میں ایک تہائی مد کا ذکر ہے۔ آپ غور کریں کہ ان روایتوں میں باہم کتنا تضاد اور تعارض معلوم ہوتا ہے کہ پہلی روایت میں ایک مد دوسری میں نصف، تیسری میں دو تہائی اور چوتھی میں ایک تہائی مد کا ذکر ہے۔ عام قاری ان تفصیلات کو پڑھنے کے بعد حیران ہو جاتا ہے کہ آخر یہ تمام روایتیں حضور ﷺ سے کیسے ثابت ہیں؟ اور اختلافِ روایات کے اسباب کیا ہیں؟

اس پیچیدہ اور مشکل مقام کی عقدہ کشائی اعلیٰ حضرت اس انداز میں فرماتے ہیں کہ اہل ایمان کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں: اقوال واحادیث سے ثابت ہے کہ وضو میں عادتِ کریمہ تثلیث تھی یعنی ہر عضو تین بار دھونا اور کبھی دو بار اعضاے وضو دھوئے جیسا کہ بخاری نے عبد اللہ بن زید اور ابو دائود و ترمذی اور ابن حبان نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے روایت کی ہے اور کبھی ایک بار دھونے پر قناعت فرمائی جیسا کہ بخاری، دارمی، ابو دائود، نسائی، طحاوی و ر ابن خزیمہ نے عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے بھی روایت فرمائی۔ (۱)

---

(۱) فتاوٰی رضویہ ج اول ص ۱۶۰۔۱۶۱، باب الغسل

غالباً جب ایک ایک بار اعضاے کریمہ دھوئے تہائی مد پانی خرچ ہوا اور دو دو بار میں دو تہائی اور تین تین بار دھونے میں پورا مد خرچ ہوتا تھا۔ ملخصاً (فتاوی رضویہ ج اول ص ۱۴۰۔۱۴۱ باب الغسل، مطبوعہ: رضا اکیڈمی) ان عبارتوں سے آپ کی دقت نظر آشکار ہوتی ہے وہیں یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ ذخیرۂ احادیث پر آپ کی نظر کتنی گہری تھی۔

تین مد پانی سے غسل کر لینے کی توجیہ: صحیح مسلم میں ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالی عنہا سے روایت ہے: إِنَّمَا كَانَت تَغْتَسِلُ هِيَ وَالنَّبِيُّ ﷺ فِي إِنَاء وَاحِد يَسَعُ ثَلٰثَةَ أَمْدَاد أَوْقَرِيبًا مِنْ ذٰلِك. وہ اور حضور ﷺ ایک برتن میں جو تین مد یا اس کے قریب کی گنجائش رکھتا تھا، نہا لیتے۔ اس پر اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں اس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ دونوں کا غسل اسی تین مد پانی سے ہو جاتا تو ایک غسل کے لیے ڈیڑھ ہی مد پانی رہا مگر علما نے اسے بعید جان کر تین توجیہیں فرمائیں۔

اوّل: یہ کہ ہر ایک کے علاحدہ غسل کا بیان ہے کہ حضور اسی ایک برتن سے جو تین مُد کے برابر تھا غسل فرما لیتے ذکرہ القاضی عیاض۔

اس پر امام احمد رضا قدس سرہ فرماتے ہیں کہ یہ توجیہ متعدّد صحیح احادیث کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ حضرت ام المؤمنین کا قصد فی اناء واحد سے یہ ہے کہ آپ نے حضور ﷺ کے ساتھ ایک برتن سے غسل فرمایا جیسا کہ اس کی مزید صراحت شیخین کی روایت تَخْتَلِفُ أَيْدِينَا فِيهِ اور مسلم کی دوسری روایت "مِنْ إِنَاء بَيْنِي وَ بَيْنَه وَاحِد فَيُبَادِرُنِي حَتّٰى اَقُوْلَ دَعْ لِي"[1] سے ہوتی ہے۔

یہ احادیث اس بارے میں صریح ہیں کہ ام المؤمنین اور حضور ﷺ نے ایک برتن سے ایک ساتھ غسل فرمایا۔

دوم: یہ کہ مد سے یہاں صاع مراد ہے تاکہ یہ فرق والی حدیث کے موافق ہو جائے جس میں فَرَق سے تین صاع مراد ہے۔ (واضح ہو کہ امام اعظم رضی اللہ تعالی عنہ کے یہاں مد دو رطل کا ہوتا ہے اور موجودہ پیمانہ سے تین پاؤ کا اور صاع ہمارے نزدیک ایک پیمانہ ہے جو آٹھ رِطل یعنی تین سیر کا ہوتا ہے۔ اس دوسری توجیہ پر اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں یہ اس کا محتاج ہے کہ مُد بمعنی صاع زبانِ عرب میں آتا ہو

(۱) فتاویٰ رضویہ ج اول ص ۱۶۰۔۱۶۱، باب الغسل

اور اس میں سخت عمل ہے ۔ فقیر نے صحاح، صراح، قاموس، تاج العروس، لغاتِ عرب مجمع بحارالانوار، نہایہ، مختصر السیوطی، لغات حدیث، طلبۃ الطلبۃ، مصباح المنیر اور لغاتِ فقہ میں اس کا پتہ نہ پایا اور بالفرض بطور شاذ اگر آیا بھی ہو تو بھی بغیر کسی قرینہ اس پر محمول کرنا صحیح نہیں۔

سوم: یہ کہ حدیث میں زیادہ کا انکار نہیں ہے تو ممکن ہے کہ جب پانی ختم ہو گیا ہو تو دونوں نے اور زیادہ فرما لیا ہو۔ اس پر فرماتے ہیں اقول: یہ بھی بعید ہے کہ اس تقدیر پر ذکر کی گئی مقدار عبث اور بے کار ہو جائے گی اور قریب تر توجیہ وہی ہے جو میں نے پہلے بیان کی، اس لیے حدیث کو اگر اشتراک پر محمول کیا جائے تو ممتنع نہیں اس لیے ابویعلی اور طبرانی کی روایت میں نصف مد سے وضو کرنے کا ذکر ہے اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مد سے کم پانی میں پورے جسم کا غسل ممکن نہیں اس کو علامہ عینی نے عمدۃ القاری میں ذکر فرمایا ہے تو اس کا مفاد یہ ہوا کہ ایک مد سے پورے جسم کا دھونا ممکن ہے اور یہاں تو ڈیڑھ مد ہے اتنے پانی سے غسل کر لینا بدرجۂ اولی ممکن ہے۔[1]

یہاں اعلیٰ حضرت کی جولانئ فکر اور فہم حدیث تو دیکھیے کہ وہ مشکل مقام جہاں حضرت قاضی عیاض اور امام نووی جیسے محققین فن کی دور بیں نگاہیں نہیں پہونچ سکیں اور ایسی توجیہات ان سے واقع ہوئیں جو راویت و درایت دونوں کے خلاف تھیں اعلی حضرت نے ان کی فروگذاشت پر تطفل ظاہر کرتے ہوئے حدیث پاک کی وہ نفیس توضیح فرمائی کہ حدیث اپنے اصل معنٰی پر باقی بھی رہی اور اعتراضات سے سالم بھی۔

زیر نظر مقالہ میں فقیہ عالم اسلام، مجدد اعظم سیدنا اعلی حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہ العزیز کی فقہی بصیرت کو فتاوی رضویہ جلد ہفتم کے آئینے میں اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے یہ اگرچہ چھوٹا منہ بڑی بات ہے، لیکن وقت کا تقاضا ہے کہ اعلی حضرت قدس سرہ کی تحقیقات، ان کے فتاوی میں موجود گنجہائے گراں مایہ کو نہایت آسان اسلوب میں لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ زیر نظر مقالہ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں تفصیل کے ساتھ فتاوی رضویہ جلد ہفتم کے حوالے سے اعلی حضرت کی فقہی بصیرت پر روشن ثبوت فراہم کیے گئے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ آپ کے فتاوی گوناگوں خصوصیات، بیش بہا افادات کے حامل ہیں مثلا: کوئی مسئلہ ایسا پیش آیا جس میں

---

(۱) فتاوی رضویہ ج اول ص ۱۶۰۔۱۶۱، باب الغسل

تعارض ادلہ کی بنیاد پر فقہا کا اختلاف منقول تھا آپ نے دلائل و براہین کی روشنی میں پہلے تطبیق دینے کی کوشش فرمائی۔ تطبیق کی صورت ممکن نہیں تھی تو ان میں سے کسی ایک کو راجح اور دوسرے کو مرجوح قرار دیا۔ جو مشکل مقامات تھے اس کی عقدہ کشائی کی، جو مسائل مبہم تھے ان کی توضیح فرمائی۔ جو مسئلہ تنقیح طلب تھا اس کی توضیح فرمائی۔ جو مسائل تشنۂ تحقیق تھے ان کی مکمل تحقیق فرمائی۔ جو مسائل غیر منصوص تھے ان کے احکام کا استنباط و استخراج منصوص مسائل کی روشنی میں فرمایا۔ جہاں متقدمین فقہا سے لغزش و خطا واقع ہو گئی تھی اس کی نشاندہی فرمائی اور شان تواضع یہ کہ ان کی فروگذاشت پر تنبیہ کو تطفل (بچکانہ پن) سے تعبیر فرمایا، ہاں مخالفین پر تعاقبات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، ان کی تحقیق کے فساد کو طشت از بام کر دیا آپ کے تعاقبات ان کے لیے سیف الٰہی سے کم نہیں۔ ذیل کی سطور میں ہم اس مقالہ کے ذیلی عناوین کی سرخیاں پیش کر رہے ہیں

ذیلی عناوین

۱. مشکلات و مبہمات کی توضیح
۲. مختلف اقوال میں ترجیح
۳. کثیر جزئیات کی فراہمی
۴. مراجع اور حوالوں کی کثرت
۵. فکر انگیز تحقیقات
۶. غیر منصوص احکام کا استنباط اور جدید مسائل کی تحقیق
۷. تخریج احادیث
۸. علم حدیث میں کمال اور قوتِ اِستنباط واِستدلال
۹. تطفلات (سہو و خطا پر تنبیہات)
۱۰. علم کلام میں مہارت
۱۱. علم تاریخ میں مہارت
۱۲. مخالفین و موافقین پر تعاقبات
۱۳. دنیاوی معاملات سے آگاہی

یہ تحقیقی مقالہ استاذ گرامی، خیر الاذکیا، عمدۃ المحققین، علامہ محمد احمد مصباحی، سابق صدر المدرسین و ناظم تعلیمات جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ کی نگرانی میں سال ۸-۲۰۰۹ ء میں اختصاص فی الفقہ کے دوران لکھا گیا، اس کو از اول تا آخر حضور خیر الاذکیا نے ملاحظہ فرماکر اصلاح فرمایا، اور انھیں کی ترتیب و اصلاح کے ساتھ سب سے پہلی بار اعلی حضرت امام اہلسنت کے عرس صد سالہ کی مناسبت سے ۱۴۴۰ھ/نومبر ۲۰۱۸ء میں فتاوی رضویہ جہان علوم و معارف کی دوسری جلد کے ساتھ المجمع الاسلامی، مبارک پور سے شائع ہوا۔ اب اسے علیحدہ کتابی شکل میں افادۂ عام کی غرض سے شائع کیا جارہا ہے۔ امید ہے کہ اس کتاب کے ذریعے اعلی حضرت امام اہل سنت مولانا شاہ احمد رضا قادری قدس سرہ کے فقہ و فتاوی کے میدان میں علو مرتبت اور کمال کو سمجھنے میں آسانی ہوگی اور اہل تحقیق اسے پڑھ کر امام اہل سنت کی عبقری شخصیت کو خراج تحسین پیش کرنے پر مجبور ہوں گے۔ راقم سطور نے حتی المقدور اپنی کم علمی و کوتاہ نظری کے باوجود فتاوی رضویہ کی ساتویں جلد پر تحقیق کی کوشش کی ہے۔

متعدّد بار پوری جلد کو پڑھ کر اس سے نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس میں ہم کہاں تک کامیاب ہوسکے ہیں یہ فیصلہ دیدہ ور قارئین اور اہل تحقیق پر چھوڑا جاتا ہے۔ میں اپنے مشفق و کرم فرما، استاذ گرامی، حضور خیر الاذکیا، سند العلما، عمدۃ المحققین، رأس المتکلّمین، علامہ محمد احمد مصباحی دامت برکاتہم العالیہ، ناظم تعلیمات و سابق صدر المدرسین، جامعہ اشرفیہ، مبارک پور کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ حضرت نے اس پر نظر ثانی فرماکر، اصلاحی عمل سے گذار کر اسے قابل اشاعت بنایا۔

یہ کتاب میرے ایک علم دوست عزیز، محب گرامی قدر حضرت مولانا غلام نبی رضوی صاحب، ساکن لُہرپٹّی، ضلع مہوتری، نیپال، حالیہ مقیم بلدیہ، قطر، کے تعاون سے چھپ کر منظر عام پر آرہی ہے اللہ تعالی مولانا کی عمر، عمل، رزق اور صحت میں برکتیں عطا فرمائے اور اسے توشۂ آخرت بناکر صدقۂ جاریہ فرمائے۔

محمد رضا قادری مصباحی

خادم تدریس: جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ ۲۴؍ شعبان المعظم ۱۴۴۲ھ

سرپرست و خادم اعلی راشٹریہ علما کونسل، نیپال ۷؍ اپریل ۲۰۲۱ء

مشکلات و مبہمات کی توضیح

پیچیدہ مقامات کی توضیح و تشریح اور مشکلات و مبہمات کی تنقیح و تبیین یہ کام کتنا اہم، دقت نظر اور وسعت مطالعہ کا متقاضی ہے وہ اہل فہم پر مخفی نہیں، امام احمد رضا قدس سرہ نے اس مشقت خیز امر کو کمال مہارت کے ساتھ سر فرمایا ہے۔ فقہاے سلف کے کلام میں جہاں خفاوابہام رہ گیا تھا انھوں نے اس کو روشن فرمایا اور جن دقیق نکات کی طرف صراحۃً ان کی توجہ نہیں ہو سکی تھی ان کی طرف لطیف اشارہ بھی فرمایا، اس ضمن میں بے شمار مثالیں آپ کے فتاوی میں موجود ہیں۔ یہاں پر چند شواہد فتاوی رضویہ جلد ہفتم سے نذر قارئین ہیں۔

(۱)

بحرالرائق کتاب البیوع میں ہے:"البیع المنهی عنه ثلثة باطل وفاسد و مکروه تحریما". وہ بیع جس سے منع کیا گیا ہے تین ہیں، باطل، فاسد، اور مکروہ تحریمی۔

اس پر اعلیٰ حضرت قدس سرہ فرماتے ہیں: والمرادصورة البیع الحاصلة من بعت و اشتریت اعم من ان یتحقق معناه الشرعی أولا. بیع ممنوع سے مراد صورت بیع ہے جو بِعتُ واِشتریت کے صیغوں سے حاصل ہوتی ہے عام ازیں کہ اس کا معنی شرعی متحقق ہو یا نہ ہو، اس لیے کہ باطل سرے سے بیع ہی نہیں بیع ممنوع ہونا تو بعد کی چیز ہے اور یہ بات مسلّم ہے کہ نہی شے کی مشروعیت کو ثابت کرتی ہے اسی توجیہ کی بنیاد پر فقہاے کرام نے بیع کی تین قسمیں فرمائیں: باطل، فاسد، صحیح، اگر یہ بیع صوری کی تقسیم نہیں ہے تو اس میں کھلا ہوا تسامح ہے۔ (۱)

(۱) فتاوی رضویہ، ج: ۷، ص: ۲۷، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی۔

اس مقام پر اعلیٰ حضرت کی نکتہ سنجی اور ژرف نگاہی ملاحظہ کیجیے کہ مختصر سی عبارت میں کتنے بڑے اعتراض کا حل پیش فرما دیا اور صاحب بحر کے کلام میں ایسی نفیس اور دل پذیر توجیہ فرمائی کہ ابہام و خفا جاتا رہا۔

﴿۲﴾

بیع باطل کی تعریف اور صاحبِ بحر کے کلام کی نفیس توجیہ

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ نے بیع باطل کی تعریف یہ فرمائی ”وہ بیع جس کے نفس عقد یا محل میں خلل ہو“ خللِ عقد جیسے مجنون کی بیع و شرا کہ اس کا قول شرعاً لا قول کے درجہ میں ہے، اور خللِ محَل جیسے مردار کی بیع کہ مردار مال ہی نہیں تو محل عقد بھی نہیں۔

اس کے بعد صاحب در مختار کا ایک قول نقل فرمایا: ” كل ماأحدث خللافی رکن البیع فھو مبطل“ ہر وہ چیز جو رکن بیع میں خلل انداز ہو وہ بیع کو باطل کرنے والی ہے۔

اس پر علامہ شامی علیہ الرحمۃ نے رد المحتار میں فرمایا ” ھو الإیجاب والقبول بأن کان من مجنون أوصبی لا یعقل فکان علیه أن یزید أو فی محله أعنی المبیع فان الخلل فیه مبطل بأن کان المبیع میتة أو حرا أو خمرا کما فی البدائع“. رکن بیع وہ ایجاب و قبول ہے۔ اس میں خلل اس طور پر کہ وہ پاگل یا ناسمجھ بچہ کی طرف سے صادر ہوں صاحب در مختار پر یہ ضروری تھا کہ او في محله کا بھی اضافہ کرتے یعنی محل (بیع) میں خلل بھی مبطل بیع ہے بایں طور کہ مردار، آزاد یا شراب کی بیع ہو جیسا کہ بدائع میں ہے۔

صاحب در مختار نے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ رکن بیع میں جو مخل ہو وہ مبطل بیع ہے اس پر علامہ شامی نے یہ گرفت فرمائی کہ علامہ علاء الدین کو اتنا اور کہنا چاہیے تھا کہ جو چیز محل بیع میں خلل انداز ہو مثلاً مردار یا آزاد یا شراب کو مبیع بنائیں تو یہ بھی مبطل

بیع ہے کہ اول الذکر دونوں بالاتفاق مال نہیں ہیں اس لیے کہ مال کے لیے ضروری ہے کہ وہ قیمت والا ہو لوگ اس کی طرف رغبت کریں اور ضرورت کے وقت اس کا اٹھا رکھنا ممکن ہو اور یہاں یہ ساری باتیں مفقود ہیں اور ثانی الذکر مسلمانوں کے یہاں مال نہیں

علامہ شامی کے اس کلام پر امام احمد رضا قدس سرہٗ کی جولانی فکر، وسعت نظر اور قلم کی عقدہ کشائی ملاحظہ فرمائیں۔ لکھتے ہیں:

أقول: الإيجاب حدث لابدله من محل كالضرب لاوجودله بدون مضروب فإذاانعدم المحل بتطرق الخلل وجب انعدام الركنين لانعدام مايتعلقان به ألاترى أن من قال: بعتك نجوم السماء وأمواج الهواء وأشعة الضياء وقال الآخر: اشتريت لم يفهم هذا إيجابا ولا قبولا في الشرع الخ.

میں کہتا ہوں: ایجاب حدث ہے، جس کے وجود کے لیے محل کا موجود ہونا ضروری ہے، جیسا کہ ضرب کا وجود بغیر مضروب کے نہیں ہو سکتا، چناں چہ جب خلل کے راہ پانے کی وجہ سے محل معدوم ہو جائے تو دونوں رکنوں (ایجاب و قبول) کا معدوم ہونا واجب ہے اس سبب سے کہ جو ان کا متعلق ہے وہ معدوم ہے، کیا آپ نہیں دیکھتے کہ جس شخص نے کہا میں نے تم سے آسمان کے تاروں، ہوا کی موجوں اور روشنی کی شعاعوں کو بیچا اور دوسرے نے کہا میں نے خریدا تو اس کو شرعا ایجاب و قبول نہیں سمجھا جاتا اسی طرح قائل کا کہنا: میں نے تجھ سے اس آزاد کی بیع کی اور اس خون کو خریدا کیوں کہ مالیت کے منعدم ہونے کے بعد کوئی فرق نہیں، خلاصہ یہ کی محل میں خلل رکن میں خلل کو واجب کرتا ہے، تو گویا خللِ رکن کے ذکر میں خلل محل بھی معنیً مذکور ہوا، ہاں !اگر صاحب در مختار محل کا بھی ذکر کر دیتے تو زیادہ ظاہر اور واضح ہوتا۔ (۱)

یہاں امام احمد رضا قدس سرہٗ نے اس نکتہ کی جانب نظر فرمائی کہ ایجاب ہو یا قبول یہ امر حادث ہیں اور حادث کے لیے کسی محل کا ہونا ضروری ہے، جس طرح

(۱) فتاوی رضویہ، ج:۷، ص:۲۸، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی

ضرب، تنہا اس کا وجود بغیر مضروب کے نہیں ہو سکتا یوں ہی ایجاب کا وجود بھی بغیر محل کے نہیں ہو سکتا اور خلل کی وجہ سے جب محل معدوم ہو تو دونوں رکن بھی لا محالہ معدوم ہوں گے، اس کو یوں سمجھیں کہ کسی شخص نے کہا میں نے تجھ سے آسمان کے تاروں، ہوا کی موجوں، اور روشنی کی شعاعوں کی بیع کی اور دوسرے نے قبول کرتے ہوئے کہا: میں نے خریدا، تو شرعا ایجاب کا تحقق ہوا نہ قبول کا اس کی وجہ یہ ہے کہ محل عقد میں خلل واقع ہوا ہے، کہ ہوا کی موج، آسمان کے ستارے، اور روشنی کی شعاعیں مال کے قبیل سے ہیں ہی نہیں جب کہ بیع کے لیے ضروری ہے کہ وہ مال متقوم ہو جب محل کا وجود نہیں ہوا تو ایجاب وقبول کا بھی وجود نہیں ہوا، اس سے یہ سمجھ میں آیا کہ محل میں خلل رکن میں خلل کا موجب ہے، تو جب رکن بیع میں خلل کا ذکر ہو گیا تو اس کے تحت ہر خلل آگیا خواہ وہ خلل رکن میں براہ راست ہو یا بالواسطہ، جیسے محل میں خلل کی وجہ سے رکن میں بھی خلل آگیا، تو گویا صاحب در مختار کے کلام میں معنوی طور پر محل بیع میں خلل کا ذکر بھی موجود ہے، ہاں! اگر خللِ محل کا ذکر بھی کر دیا جاتا تو اور واضح ہو جاتا۔

اس سے آپ کی دقت نظر بخوبی عیاں ہوتی ہے۔

(۳)

مال کی چار قسمیں اور ان میں ہر ایک کے مبیع وثمن ہونے کی مکمل تحقیق

بحر الرائق وغیرہ میں ہے کہ مال کی چار قسمیں ہیں:

اول: وہ کہ ہر حال میں ثمن ہی رہتا ہے، یہ سونا چاندی ہیں۔ خواہ ان کے عوض کوئی شے بیچی جائے یا ان کو کسی چیز کے عوض بیچا جائے، اہل عرف اسے ثمن کہیں یا نہ کہیں، مثلاً: سونے اور چاندی سے برتن بنا لیے گئے اور اس میں جو صناعی اور کڑھائی ہوئی اس کی وجہ سے وہ ثمن خالص نہ رہ گئے اس کے باوجود اس کی بیع، شرعًا بیعِ صرف ہی ٹھہرے گی یعنی ثمن سے ثمن کو بیچنا۔ (۱)

(۱) فتاوی رضویہ، ج: ۷ ص: ۱۳۲، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی (رسالہ کفل الفقیہ الفاھم فی احکام

دوم: وہ مال جو ہر حال میں مبیع ہے جیسے: کپڑے اور چوپائے۔

اس قسم دوم پر علامہ طحطاوی کی طرف سے یہ ایراد قائم ہوا، کہ بیع مقایضہ (جس میں متاع کو متاع کے بدلے بیچا جاتا ہے) اس میں دونوں متاع من وجہ ثمن ہیں ۔ مثلاً: ہم نے کپڑے کو کپڑے کے بدلے میں بیچا تو یہ بیع مقایضہ ہوئی اور کپڑا من وجہٍ سامان ہے اور من وجہٍ ثمن بھی تو آپ کا یہ کہنا کہ کپڑے اور چوپائے ہر حال میں مبیع ہی ہوتے ہیں یہ صحیح نہیں۔

علامہ شامی کی توجیہ: علامہ شامی نے بحر کے دفاع میں قسم دوم کی توجیہ یہ فرمائی:

وہ مال جو ہر حال میں مبیع ہو مثلاً: کپڑا اور چوپایہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ان کے عوض میں کوئی چیز بیچی جائے اور ان کا مبادلہ کسی شئے سے ہو تو وہ کبھی ذمہ پر دین ہو کر لازم نہیں ہوں گے، اور ثمن ہونے کے یہی معنی ہیں کہ ذمہ پر دین ہو کر لازم ہو، اور بیع مقایضہ میں دونوں متاعوں میں سے کوئی بھی ذمہ میں دین ہو کر لازم نہیں ہوتے لہٰذا وہ مبیع ہی رہے ثمن نہ ہوئے۔

اس پر اعلیٰ حضرت کا اعتراض: علامہ شامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مذکورہ توجیہ پر اعلیٰ حضرت یہ نقض وارد فرماتے ہیں:

أقول: وفيه أن المصوغ من الحجرين أيضا لا يثبت دينا فى الذمة بل يتعين فى العقود كما تقدم من البحرفإن سلم هٰذا ورد النقض على ذلك فليتا مل.اهـ.[1]

اس ایراد کی توضیح یہ ہے: آپ کا یہ کہنا کہ ثمن ہونے کا معنی ہی یہی ہے کہ ذمہ پر دین کے طور پر لازم ہو اور جو ذمہ میں لازم نہ ہو وہ ثمن نہیں، صحیح نہیں، کیوں کہ چاندی اور سونے کی گڑھی ہوئی چیزیں مثلاً: برتن یا گہنا وغیرہ، یہ بھی ذمہ پر دین نہیں ہوتے بلکہ

قرطاس الدراهم)
(۱) فتاوی رضویہ، ج:۷، ص:۱۳۳، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی

عقد میں متعیّن ہوجاتے ہیں، جیساکہ بحر الرائق کے حوالے سے گزرا، حالاں کہ یہ بالاتفاق ثمن ہیں یہ الگ بات ہے کہ خالص ثمن نہیں رہے، جیساکہ ابھی بحر کے حوالے سے بیان کیا گیا، پس اگر آپ کی یہ توجیہ قبول کرلی جائے تو خود بحر پر نقض وارد ہوجائے گا، پس چاہیے کہ بحر کی عبارت کی کوئی ایسی توجیہ پیش کی جائے جو ان ایرادات سے خالی ہو۔

اب خود اعلیٰ حضرت، علامہ طحطاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے سابق ایراد کا جواب دے رہے ہیں:

والأظهر عندي الجواب بأن كل سلعة فى المقايضة مبيع أيضا ولايمكن أن تصير ثمنا محضا وإن كان لها وجهة إلى الثمنية من حيث إن البيع لايقوم إلا بالبدلين بخلاف القسم الآتى فإنه تارة يصير ثمنا بحتا وأخرى مبيعا خالصا فمعنى القسمين أنه لاينفك عنه كونه ثمنا أوكونه مبيعابشيء من الأحوال وإن اعتراه وجهة أخرى ايضا فى بعض الحال.اهـ.[1]

اور میرے نزدیک صاف جواب یہ ہے کہ بیع مقایضہ میں ہر شَے مبیع ہے اور ثمن خالص نہیں ہو سکتی اگر چہ اس کا ایک رخ ثمنیت کی طرف بھی سہی، اس لیے کہ بیع بغیر ثمن و مبیع دونوں کے نہیں ہو سکتی بخلاف قسم آئندہ کے کہ وہ کبھی خالص ثمن ہوتی ہے اور کبھی خالص مبیع، تو ان دونوں قسموں کے یہ معنی ہیں کہ اس کا ثمن یا مبیع ہونا کسی حال اس سے جدا نہ ہو، اگر چہ بعض اوقات اسے دوسرا رخ بھی عارض ہو۔

ماقبل میں گزرا کہ علامہ طحطاوی نے صاحب بحر پر بیع مقایضہ کے ذریعے اعتراض کیا تھا کہ اس میں دونوں متاع من وجہ ثمن ہیں، اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں: بیع مقایضہ میں ہر شَے مبیع بھی ہے اور من وجہ ثمن بھی جیساکہ طحطاوی نے فرمایا: خالص ثمن نہیں ہے اگر چہ اس کا ایک رخ ثمنیت کی طرف بھی ہے اس لیے کہ بیع بغیر مبیع و ثمن کے منعقد ہی نہیں ہو سکتی، اگر دونوں متاعوں کو مبیع ہی تسلیم کرلیا جائے ثمن کو

(۱) فتاوی رضویہ، ج:۷، ص:۱۳۳، مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی

چھوڑ کر تو بھی صحیح نہیں۔

توصاحب بحر کے کلام میں دونوں قسموں کا مطلب یہ ہوا، کہ اس کا ثمن یا مبیع ہونا کسی حال میں اس سے جدا نہ ہو یعنی سونا چاندی سے ثمنیت کبھی ختم نہیں ہو سکتی اگرچہ بعض اوقات کسی صنعت کی وجہ سے مبیع بھی بن جاتے ہیں، اسی طرح کپڑے اور چوپایے سے مبیع ہونا کسی حال میں جدا نہیں ہوتا اگرچہ من وجہٍ ثمنیت بھی عارض ہو جائے۔

مذکورہ بالا توضیحات سے اعلیٰ حضرت کی فقہی بصیرت ، ژرف نگاہی، دقت نظری اور اعلیٰ دماغی کا پتا چلتا ہے، کہ بحر کی عبارت کی ایسی نفیس اور دل پذیر توجیہ آپ نے فرمائی کہ علامہ طحطاوی کا اعتراض بھی دفع ہو گیا اور علامہ شامی کی توجیہ میں جو نقص تھا وہ بھی نہ رہا۔

صاحب تنویر الابصار پر تطفل:

اعلیٰ حضرت نے مال کی قسم سوم یہ بیان فرمائی: الثالث مالوَصْفٍ فی ذاته ثمن تارة ومبيع اخرى.

وہ جن کی ذات میں کوئی ایسا وصف ہے جس کے سبب کبھی ثمن اور کبھی مبیع ہوتے ہیں، صاحب تنویر نے مال کی قسم سوم یہ بیان فرمائی تھی،: کہ ایک جہت سے ثمن ہو اور ایک جہت سے مبیع، اس پر اعلیٰ حضرت نے یہ فرمایا:

ولا أقول كقول التنوير :ثمن من وجه، مبيع من وجه ليعود حديث المقايضة أقول وانمازدت "لوصفٍ فی ذاته" احترازاً عن القسم الرابع فإنه أيضا يصير مرة ثمنا و أخرى لا، لالو صف فی ذاته بل للاصطلاح وعدمه.[1]

صاحب تنویر نے یہ کہا تھا کہ ایک جہت سے ثمن ہو اور ایک جہت سے مبیع میں ایسا نہیں کہوں گا کہ مقایضہ والی بات پلٹ پڑے، اور میں نے یہ قید کہ اس کی ذات

(۱) فتاوی رضویہ، ج:۷، ص:۱۳۴، مطبوعہ رضا اکیڈمی، ممبئی

میں کوئی ایسا وصف ہو اس لیے بڑھا دی کہ چوتھی قسم خارج ہو جائے کیوں کہ وہ بھی تو کبھی ثمن ہوتی ہے، اور کبھی نہیں، لیکن اپنے کسی وصف کی بنیاد پر نہیں بلکہ اصطلاح و عدم اصطلاح کی بنیاد پر۔

مختلف اقوال میں ترجیح

مختلف اقوال میں ترجیح بڑا اہم کام ہے، جسے اجلۂ فقہا نے اپنی فقاہت اور وسعت علم کے سہارے بڑی عالی ہمتی سے انجام دیا، لیکن جہاں ان سے کوئی ترجیح منقول نہ ہو، یا جہاں مختلف تصحیح و ترجیح منقول ہوں، وہاں یہ کام اور زیادہ مشکل ہو جاتا ہے، مگر یہاں بھی اعلیٰ حضرت کا قلم حق رقم اور دقت نظر لائق خراج تحسین ہے کہ اس دشوار ترین مرحلے کو بھی کامیابی کے ساتھ سر فرمایا ہے۔

ذیل کی سطور میں اس ضمن میں چند شواہد نذر قارئین ہیں:

(۱)

"قبول" "ہبہ" کا رکن نہیں ہے، مختلف اقوال فقہا میں ترجیح اور فقہی شواہد و جزئیات سے حکم مذکور کی تائید و توثیق

باب بیع میں اس کے ارکان، ایجاب و قبول ہیں لیکن باب ہبہ میں صرف "ایجاب" بالاتفاق اس کا رکن ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا ایجاب ہی کی طرح قبول بھی ہبہ کا رکن ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلے میں فقہائے کرام کی آرا ایک دوسرے سے مختلف ہیں بعض حضرات نے قبول کو بھی مثل ایجاب ہبہ کا رکن قرار دیا ہے، اور بعض نے اس کی نفی کی ہے۔

اعلیٰ حضرت قدس سرہ رقم طراز ہیں:

ہمارے مشایخ مذہب رحمہم اللہ تعالیٰ کو اختلاف ہے کہ قبول بھی مثل ایجاب، رکن ہبہ ہے یا نہیں؟

مشی علی الأول فی الکافی والکفایة والتنویر والدر و هبة الهدایة وقال الاتقانی: إنه قول الإمام علاؤالدین فی تحفة الفقهاء ومشی علی الثانی فی الحصر والمختلف والنهایة والدرایة والعنایة والعینی و عامة الشروح قال الاتقانی : إنه قول الإمام شیخ الإسلام خواهر زاده فی مبسوطه وبه جزم فی کتاب الأیمان من الهدایة والکرمانی والتاویلات.ومحیط السرخسی.اهـ.[1]

کافی، کفایہ، تنویر الابصار، در مختار اور ہدایہ کے باب الہبہ میں قول اول کو اختیار فرمایا ہے، اتقانی نے کہا: تحفۃ الفقہامیں امام علاء الدین کا یہی قول ہے۔

اور حصر، مختلف، نہایہ، درایہ، عنایہ، عینی، اور عامۂ شروح میں قول ثانی کو اختیار فرمایا ہے، اتقانی نے کہا: شیخ الاسلام خواہر زادہ نے اپنی مبسوط میں یہی قول کیا ہے، اور اسی پر ہدایہ کی کتاب الأیمان، کرمانی، تاویلات اور محیط سرخسی میں جزم کیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا عبارات سے دو طرح کے قول سامنے آئے بعض فقہا نے قبول کو رکن قرار دیا اور بعض نے اس کی نفی کی، لیکن بات اب بھی واضح نہیں ہوتی کہ اس میں راجح مفتی بہ کون سا قول ہے ؟ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ نے اس مشکل امر کو نہایت آسانی سے حل فرمایا ہے اور دلائل و براہین کی روشنی میں نہایت ہی دقت نظری سے یہ ثابت فرمایا ہے کہ راجح و معتمد اور مفتی بہ قول ثانی ہے، اور اصول بھی اس کا مقتضی ہے۔

ہم ان کے دلائل و براہین کا خلاصہ اپنے الفاظ میں سپرد قلم کر رہے ہیں:

اعلیٰ حضرت کا موقف یہ ہے کہ قبول رکن نہیں زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ثبوت ملک کی شرط ہے، رہا واہب کے اذن سے مجلس میں قبضہ تو یہ بھی قبول نہیں بن سکتا بلکہ قبول کا قائم مقام ہو جائے گا اور تحقیق یہ ہے کہ قبضہ بھی بذات خود ثبوت ملک کی شرط ہی ہے۔

---

(۱) فتاوی رضویہ، ج:۷، ص:۴۳۵، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی

پہلی دلیل: امام ملک العلما ابو بکر بن مسعود کاشانی بدائع میں تصریح فرماتے ہیں:

قبول کا رکن ہونا امام زفر کا قول اور قیاس ہے، استحسان عدم رکنیت ہے، اور یہ معلوم ہے کہ چند مسائل کو چھوڑ کر سب میں عمل ہمیشہ استحسان پر ہے اور مسئلۂ مذکورہ ان مسائل سے نہیں لہٰذا بطور استحسان یہ ثابت ہوا کہ قبول رکن نہیں۔

دوسری دلیل: فتاوی قاضی خان اور حاوی الفتاوی میں یہ مسئلہ مذکور ہے کہ موہوب لہ کا قبضہ مجلس ہبہ کے بعد جب کہ یہ قبضہ واہب کی اجازت سے ہو مثبت ملک ہے، اگرچہ موہوب لہ نے یہ نہیں کہا کہ میں نے قبول کیا، اور امام قاضی خان اور صاحب حاوی الفتاویٰ نے صراحۃً فرمایا: "به نأخذ" "ہم اسی کو اختیار کرتے ہیں، یہ لفظ اعاظمِ الفاظِ افتا سے ہے، جیسا کہ درر وغیرہا میں ہے۔

تیسری دلیل: قبضہ اگرچہ قائم مقام قبول ہے مگر قبول رکن ہوتا تو ماورائے مجلس پر موقوف نہ رہ سکتا۔[1]

اس تیسری دلیل کا مطلب یہ ہے کہ شئ موہوب پر موہوب لہ نے اس وقت قبضہ کیا جب مجلس ہبہ برخاست ہو چکی تھی اور یہ قبضہ باذن واہب تھا تو قاضی خان اور صاحب حاوی الفتاوی جیسے محقق فرماتے ہیں: کہ اس طرح سے ملکیت ثابت ہو گئی، اگرچہ موہوب لہ نے قبول کردم کا لفظ نہ کہا ہو اور اگر قبول رکن ہوتا تو مجلس ہبہ کے ماسوا پر موقوف نہ رہتا، اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

لأن الايجاب لفظ ، واللفظ عرض والعرض لايبقىٰ زمانين فلا يمكن ارتباط القبول به إلا إذا تحقق فى مجلسه لأن الشرع جعل المجلس جامع الكلمات.اهـ.[2]

قبول کے عدم رکنیت پر یہ دلیل بہت ہی قوی ہے جو اعلیٰ احضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے

(۱) فتاوی رضویہ، ج:۷، ص:۴۳۶ مطبوعہ، رضا اکیڈمی
(۲) فتاوی رضویہ، ج:۷، ص:۴۳۶ مطبوعہ، رضا اکیڈمی

ارشاد فرمائی۔

اس لیے کہ ایجاب ایک لفظ ہے اور لفظ عرض ہے اور عرض دو زمانوں میں باقی نہیں رہتا تو ایجاب سے قبول کا ربط نہیں ہوا، اس لیے کہ قبول تو دوسرے زمانے میں متحقق ہے پھر ذہن میں ایک سوال ابھرا کہ ٹھیک ہے عرض دو زمانوں میں باقی نہیں رہتا لیکن مجلس ہبہ میں بھی تو ایجاب وقبول کا ایک زمانے میں پایا جانا ممکن نہیں ہے اس لیے کہ ایجاب کا زمانہ کچھ اور ہوگا اور قبول کا کچھ اور۔ تو اس کا جواب اس طور پر دیا کہ شرع نے مجلس کو جامع کلمات متعدّدہ بنادیا ہے اس لیے دونوں ایک ہی زمانے میں پائے گئے۔ یعنی جب ایک مجلس میں ایجاب اور قبول دونوں پا لیے گئے تو شرعًا دونوں ایک زمانے میں مانے گئے۔

ایک نظیر پیش فرما کر اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ مزید اس مسئلے کو منقح فرما رہے ہیں، ملاحظہ کریں:

خود ہدایہ ودر مختار وغیرہ عامہ کتب میں تصریح فرمائی کہ اگر زید نے قسم کھائی "ہبہ نہ کروں گا" پھر عمرو سے کہا یہ شَے میں نے تجھے ہبہ کی اور عمرو نے ہبہ قبول نہ کیا قسم ٹوٹ گئی، کہ ہبہ صرف اس کے ایجاب سے متحقق ہوگیا، اگرچہ عمرو نے قبول نہ کیا۔ اور قسم کھائی کی نہ بیچے گا پھر عمرو سے کہا میں نے یہ شَے تیرے ہاتھوں بیچی اور عمرو نے قبول نہ کیا قسم نہ ٹوٹی کہ بیع بے ایجاب وقبول دونوں کے متحقق نہ ہوگی تو بے قبول مشتری بیچنا صادق نہ آیا، یہ چوتھی وجہ اس قول کی ترجیح کی ہے کہ عام کتب معتمدہ حتی کہ ان میں بھی جو رکنیت کی تصریح کرتی تھیں یہ مسئلہ یوں ہی مسطور ہے، جس سے عدم رکنیت روشن ومنصور ہے۔ (۱)

امام احمد رضا قدس سرہ نے دو نظیریں پیش فرمائیں، پہلی نظیر سے یہ ثابت ہوا کہ اگر قبول رکن ہوتا تو زید کی قسم نہیں ٹوٹتی حالاں کہ ٹوٹ گئی، اور دوسری نظیر سے معلوم

(۱) فتاوی رضویہ، ج:۷، ص:۴۳۶ مطبوعہ، رضا اکیڈمی

ہوا کہ زید کی قسم نہیں ٹوٹی اس لیے کہ قبول پایا ہی نہیں گیا جو کہ بیع کا رکن ہوتا ہے اس سے اعلیٰ حضرت کے کمال فقاہت اور تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔

﴿۲﴾

ثمن خلقی کو اگر ثمنِ غیر خلقی کے عوض بیچا گیا تو اس میں تقابضِ بدلین شرط نہیں ہے

سونے اور چاندی جو پیدائشی طور پر ثمنیت کے لیے وضع کیے گئے ہیں ان کی بیع صَرف کہلاتی ہے جب سونے کو چاندی یا چاندی کو سونے کے عوض بیچا جائے یا سونے کو سونے، چاندی کو چاندی سے بیچا جائے، تو یہ بیعِ صَرف ہے اور اس کی شرط یہ ہے کہ دونوں جانب قبضہ ضروری ہے اگر کسی جانب ادھار رہا تو یہ بیع صحیح نہیں ہوگی اور جو چیز خلقی طور پر ثمن نہیں ہے بلکہ اصطلاح ناس اور رواج کی بنیاد پر اسے ثمن کا حکم دے دیا گیا مثلاً: پیسہ اور کرنسی نوٹ، اگر ان میں سے کسی کو درہموں یا دیناروں کے عوض بیچا گیا تو کیا تقابض یعنی طرفین کا قبض بالید ہونا شرط ہوگا یا نہیں، اس بارے میں فقہا کی دو رائیں ہیں:

اکثر فقہا کا مذہب یہ ہے کہ پیسے کی بیع دراہم و دنانیر کے ساتھ صَرف نہیں پھر تقابض کی حاجت بھی نہیں، یہ بات انھوں نے فلوس کی اصل خلقت پر نظر رکھنے کے بعد کہی، امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مبسوط میں اسی پر نص فرمایا، محیط، حاوی، بزازیہ، بحر الرائق، نہر الفائق، فتاوی حانوتی، تنویر الابصار، در مختار، ہندیہ وغیرہا متون مذہب اور ان کی شروح و فتاویٰ میں اسی پر اعتماد فرمایا اور یہی مفاد ہے امام اسبیجابی کے کلام کا۔

اور دوسرے طبقہ کے فقہا جنھوں نے اصطلاحی ثمن ہونے کا لحاظ کیا انھوں نے جانبین کے قبضہ کو شرط ٹھہرایا، علامہ قاری الہدایہ کا فتوی اسی پر ہے، حضرت عمر بن نجیم حنفی نے ان کے اس فتوی کی تاویل اس طور پر کی کہ اس سے اختلاف رفع

ہو جاتا ہے، اور علامہ شامی نے یہ کہہ کر ان سے اختلاف کیا کہ علامہ قاری الہدایہ کا قول اس معنی پر محمول کیا جائے گا جس پر جامع صغیر میں امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا کلام دلالت کرتا ہے، اور وہ کلام یہ ہے کہ تقابضِ جانبین شرط ہے، ان تمام باتوں کی تفصیل ردالمحتار میں ہے۔

مذکورہ بالا تحریر سے دو باتیں سامنے آئیں اول بیع الفلوس بالدراہم میں فقہاے کرام کا اختلاف ہے، کہ تقابض شرط ہے یا قبضہ من احد الجانبین کافی ہے دوم یہ کہ علامہ قاری الہدایہ کے فتوی کو علامہ شامی نے امام محمد کے اس کلام پر محمول فرمایا جس کی دلالت اس پر ہو رہی ہے کہ جانبین سے قبضہ شرط ہے۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اس میلان پر اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ نے ادب کے پیرایے میں شدید گرفت فرمائی ہے اور اس میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ جامع صغیر جو امام محمد کی کتاب ہے میں نے اس کی طرف مراجعت کی تو اس میں کوئی ایسی عبارت نہیں ملی جس سے تقابض کا شرط ہونا مستفاد ہوتا ہو، فرمایا:

قال العبد الضعیف غفرالله له: وماجنح إلیه الفاضل الشامی سیدی محمد بن أمین الدین اٰفندی ابن عابدین رحمة الله تعالیٰ علیه من دلالة کلام الجامع الصغیر علی ذٰلك الاشتراط فقد تبع فیه صاحب البحروالعلامة زین الدین عول علی ما وقع فی الذخیرة کما هو مذکور فی الحاشیة الشامیة ، ولکن لی فیه تامل بعد، فإنی راجعت الجامع فوجدت نصه هکذا عن محمد عن یعقوب عن أبی حنیفة رضی الله تعالیٰ عنهم: رجل باع رطلین من شحم البطن برطل من ألیة أو باع رطلین من اللحم برطل من شحم البطن أوبیضة ببیضتین أو جوزة بجوزتین أو فلسا بفلسین أوتمرا بتمرتین یدا بید بأعیانهما یجوز وهو قول أبی یوسف رحمه الله وقال محمد رحمه الله لایجوز فلس بفلسین ویجوز تمرة بتمرتین انتهی کلامه

الشریف. [1]

ترجمہ: بندۂ ضعیف غفرلہ کہتا ہے علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ جس طرف مائل ہوئے یعنی یہ کہ جامع صغیر کا کلام اس شرط پر دلالت کر رہا ہے اس میں انھوں نے صاحب بحر کی پیروی کی ہے اور علامہ زین الدین نے اس پر اعتماد کیا جو ذخیرہ میں ہے جیسا کہ حاشیہ شامی میں مذکور ہے لیکن مجھے اس میں ابھی بھی تامل ہے میں نے جامع صغیر کی طرف رجوع کیا تو اس کے نص کو یوں پایا، امام محمد نے امام ابو یوسف سے انھوں نے امام اعظم سے روایت کیا، رضی اللہ تعالیٰ عنہم، ایک شخص نے دو رطل پیٹ کی چربی ایک رطل سُرین کی چربی کے عوض، یا دو رطل گوشت ایک رطل پیٹ کی چربی کے عوض بیچا، یا ایک انڈا دو انڈوں کے عوض، یا ایک اخروٹ دو اخروٹ کے عوض، یا ایک پیسہ دو پیسوں کے عوض یا ایک کھجور، دو کھجوروں کے بدلے فروخت کیا تو جائز ہے جب کہ ان چیزوں کا لین دین دست بدست، تعیین کے ساتھ ہو۔ انتہی

یہاں تک اصل عبارت کا ترجمہ تھا اس کے بعد اس عبارت سے حضرت علامہ شامی نے تقابض پر کیسے استدلال فرمایا اس کو ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول اس عبارت میں محل استنباط آپ کا قول "یداً بیدٍ" ہے، جس کا مفہوم علامہ شامی نے دست بدست اور تقابض جانبین لیا ہے، علامہ شامی کے مذکورہ استدلالوں پر امام احمد رضا قدس سرہ نے جو بصیرت افروز کلام فرمایا ہے وہ یقیناً دل کی آنکھوں سے پڑھنے کے لائق ہے، ہم اس کا حاصل ذیل کی سطور میں نذر قارئین کرتے ہیں۔

لیکن فقہی مہارت رکھنے والا یہ جانتا ہے کہ یداً بید کا لفظ تقابض بالبراجم کے بارے میں نص صریح نہیں، یعنی صراحۃً اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انگلی کے پوروں کے ساتھ قبضہ کرنا ضروری ہے، بلکہ یداً بید سے عینیت مراد ہے کہ لین دین

(۱) فتاوی رضویہ، ج:۷، ص:۲۵۷-۲۵۸، مطبوعہ، رضا اکیڈمی

کی وہ اشیا معین ہوں، کیا نہیں دیکھتے کہ ہمارے علمائے کرام نے حدیث معروف میں اس کی تفسیر عینیت سے فرمائی ہے جیسا کہ ہدایہ میں علامہ برہان الدین مرغینانی نے فرمایا:

ومعنى قوله عليه الصلاة والسلام يدًا بيدٍ عينا بعين كذا رواه عبادة بن الصامت رضى الله عنه.(۱)

حضور ﷺ کے قول يداًبيدٍ کا معنی عيناً بعين ہے، یوں ہی اس کو حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کیا ہے۔

اس کے بعد رقم طراز ہیں:

كيف و قد قال أصحابنا رضى الله تعالىٰ عنهم إن التقابض إنما يشترط فى الصرف وأماماسواه ممايجرى فيه الربا فإنما يعتبر فيه التعيين.

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قول امام میں يداًبيد کا معنی دست بدست ہو جب کہ ائمۂ احناف رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے فرمایا ہے کہ تقابض صرف بیع صَرف میں شرط ہے اور اس کے علاوہ جس میں سود جاری ہوتا ہے یعنی سود کا تحقق ہوتا ہے تو وہاں فقط تعیین معتبر ہے پس ہماری ذکر کردہ عبارت میں قول امام کو تقابض (دو طرفہ قبضہ) پر محمول کیا جائے اور اس سے ایک پیسہ کی دو پیسوں کے عوض بیع میں تقابض کا شرط ہونا اخذ کیا جائے تو پھر ایک کھجور کی دو کھجوروں کے عوض، ایک انڈے کی دو انڈوں کے عوض اور ایک اخروٹ کی دو اخروٹوں کے عوض بیع میں بھی تقابض شرط ہو گا، اس لیے کہ یہ تمام مسائل ایک سیاق کے تحت لائے گئے ہیں، لہٰذا حکم بھی ایک ہی ہونا چاہیے حالاں کہ ہمارے ائمۂ کرام اس کے قائل نہیں، لہٰذا اس کا اشتراط تعیین پر محمول کرنا واجب ہوا، اور یہ ماننا پڑے گا کہ امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول بأعيانها "يدابيد" کی تفسیر ہے ورنہ یہ قول لغو اور بلا ضرورت ہو گا کیوں کہ اگر "يداًبيدٍ" کے معنی "تقابض" ہوں تو اس کے بعد

---

(۱) الهداية ،كتاب البيوع، باب الربا،مطبع يوسفى لكهنؤ،۳/ ۸۳.

"باعیانہا" کہنے کی کوئی ضرورت نہیں، اس لیے کہ "تقابض" میں تعیین کا معنی کچھ اضافے کے ساتھ موجود ہے اور جب تقابض کے اندر تعیین کا معنی کچھ اضافے کے ساتھ پایا جارہا ہے تو پھر اس تعیین کو تقابض کے بعد "باعیانہا" کے ذریعہ ذکر کرنے کا کیا فائدہ رہ جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ صاحب ہدایہ نے جب اس مسئلہ کو جامع صغیر سے نقل کیا تو اس میں سے یہ کلمہ "یدًا بیدٍ" ساقط کر کے فقط عینیت کے ذکر پر اکتفا کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے (یعنی امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کما صرح به العلامة العینی فی البنایة) فرمایا:

یجوز بیع البیضة بالبیضتین والتمرة بالتمرتین والجوزة بالجوزتین ویجوز بیع الفلس بالفلسین بأعیانهما .اهـ.[۱]

ایک انڈے کو دو انڈوں، ایک کھجور کو دو کھجوروں، ایک اخروٹ کو دو اخروٹوں، اور ایک پیسہ کو دو معین پیسوں کے عوض میں بیچنا جائز ہے۔ (راقم)

اس نفیس گفتگو اور چشم کشا تحریر کے بعد امام احمد رضا قدس سرہ القوی بڑی خود اعتمادی کے ساتھ فیصلہ کن انداز میں فرماتے ہیں:

فلیس فی الجامع إن شاء الله تعالیٰ دلیل علی ما ذکرهٰؤلاء الأعلام الخ.

پس جامع صغیر میں ان فقہاے کرام کی مذکورہ باتوں پر کوئی دلیل نہیں اور اگر ہو تب بھی غیر کا احتمالِ بیّن ہوتے ہوئے اس کا ارادہ نہیں کیا جائے گا، بر خلاف اصل یعنی مبسوط کی عبارت کے کہ وہ تقابض کے شرط نہ ہونے پر نص ہے، جیسا کہ آگے آرہا ہے چناں چہ اسی پر اعتماد کرنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ ہی مالک توفیق ہے۔ اس قدر محققانہ گفتگو اور عُقدۂ لاینحل کو سلجھانے کے بعد تواضع تو دیکھیے فرماتے ہیں:

هذاماسنح للعبد القاصر فتامله فإن وجدته حقاً فعلیك به

(۱) الفتاوی الرضویة ۷/ ۲۵۸، رضا اکیڈمی ممبئی

وإلا فارم به الجدار.[۱]

یہ حقیقت ہے جو اس کوتاہ بندے پر منکشف ہوئی پس آپ بھی اس میں غور کریں اگر اسے حق پائیں تو اسے لے لیں ورنہ اسے دیوار سے دے ماریں۔ (راقم)

بالجملہ مذہب راجح پر بیع الفلوس بالدراہم والدنانیر میں ایک ہی جانب کا قبضہ کافی ہے۔

امام اہل سنت رضی اللہ تعالیٰ علیہ نے ماقبل میں جس موقف کی تائید واثبات میں پر زور دلائل پیش کیے اسی موقف کی ترجیح میں اب چند فقہی جزئیات بھی نقل فرماتے ہیں، جن میں امام محمد علیہ الرحمۃ کی مبسوط سرفہرست ہے۔

فی المبسوط إذا اشتری الرجل فلوسا بدراهم ونقد الثمن ولم تكن الفلوس عند البائع فالبيع جائز.اهـ .كذا فی الهندية۔

مبسوط میں ہے کہ جب کسی نے درہموں کے عوض پیسے خریدے اور ثمن نقد ادا کر دیا مگر بائع کے پاس اس وقت پیسے موجود نہیں تھے تو بیع جائز ہے ایسا ہی ہندیہ میں ہے۔ (ر)

وفيها عن الحاوی وغيره لو اشتری مائة فلس بدرهم فقبض الدرهم ولم يقبض الفلوس حتی كسدت لم يبطل البيع قياسا ولو قبض خمسين فلسا فكسدت بطل البيع فی النصف ولولم تكسد لم يفسد وللمشتری ما بقی من الفلوس.اهـ. ملتقطا.[۲]

ترجمہ: ہندیہ میں حاوی وغیرہ سے منقول ہے، اگر کسی نے ایک درہم کے عوض میں سو پیسے خریدے، اور بائع نے درہم پر قبضہ کر لیا مگر مشتری نے ابھی پیسوں پر قبضہ نہیں کیا تھا کہ اس کا چلن بند ہو گیا تو قیاس کی رو سے وہ بیع باطل نہ ہوئی ہاں! اگر پچاس پیسوں پر قبضہ کر لیا تھا کہ چلن بند ہو گیا تو نصف میں بیع باطل ہو گئی اور اگر بند نہ ہوتا تو

(۱) الفتاوی الرضوية ۷/ ۲۵۸ باب الصرف.

(۲) الفتاوی الرضوية:۷/ ۲۵۸ باب الصرف.

باطل نہ ہوتی اور مشتری باقی پیسے لینے کا حق دار ہوتا۔ اھ۔ ملتقطا۔[۱]

وفي التنوير وشرحه: باع فلوسا بمثلها أوبدراهم أوبدنانير فإن نقد أحدهما جاز وإن تفرقا بلا قبض أحد هما لم يجز.اهـ.[۲]

تنویر اور اس کی شرح میں ہے، کسی نے پیسوں کو ان کے مثل یا درہموں کے عوض یا دیناروں کے بدلے بیچا تو اگر ان دونوں میں سے کسی ایک نے نقد ادائگی کر دی تو جائز ہے، اور اگر وہ دونوں بغیر قبضہ کیے ہوئے جدا ہو گئے تو ناجائز ہے۔ اھ۔

اکثر فقہا نے جس موقف کو اختیار فرمایا ہے اس کی تائید مبسوط کی مذکورہ عبارت سے بھی ہو رہی ہے اس میں یہ کہا گیا ہے کہ جب کوئی شخص درہموں کے عوض پیسوں کو خریدے اور ثمن نقد ادا کر دے اور بائع کے پاس اس وقت پیسے موجود نہ ہوں تو بیع جائز ہے۔ کیا یہ اس پر نص صریح نہیں کہ تقابض شرط نہیں، ورنہ جواز بیع کا کیا معنی؟ اسی طرح حاوی قدسی وغیرہ میں ہے کہ ایک درہم کے عوض کسی نے سو پیسے خریدے پھر پیسوں کا چلن بند ہو گیا اور مشتری نے ابھی قبضہ نہیں کیا تھا، اور بائع درہم پر قبضہ کر چکا ہے تو از روے قیاس وہ بیع باطل نہ ہوئی، غور کریں، یہاں صرف بائع نے درہم پر قبضہ کیا ہے اور مشتری نے پیسوں پر قبضہ نہیں کیا ہے پھر بھی بیع باطل نہ ہوئی تو اگر بیع الفلوس بالدراہم میں تقابض شرط ہوتا تو ہر گز بیع صحیح نہ ہوتی، یوں ہی تنویر اور در مختار کی عبارت سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ بیع مذکورہ میں جانبین میں سے کسی ایک نے قبضہ کر لیا تو بیع صحیح ہے اور بلا قبضہ دونوں جدا ہو گئے تو صحیح نہیں۔

یہ تھے وہ روشن نصوص جن کی روشنی میں امام احمد رضا قدس سرہ نے پہلے قول کو راجح قرار دیا اور علامہ شامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے علامہ قاری الہدایہ کے قول کو جس معنی پر محمول کیا اس کا بطلان نصوص فقہا کی روشنی میں واضح فرمایا اور نقض بھی وارد کیا کہ اگر یداً بید سے مراد دست بدست تقابض کے ساتھ بیع کرنا ہے تو اس میں صرف پیسوں

---

(۱) الفتاوی الرضویة: ۷/ ۲۵۸ باب الصرف.

(۲) الفتاوی الرضویة: ۷/ ۲۵۸ باب الصرف.

ہی کی کیا تخصیص کھجور، اخروٹ اور انڈوں میں بھی یہی حکم جاری ہو گا اس لیے کہ یہ سب ایک سیاق کے تحت لائے گئے ہیں حالاں کہ آپ بھی اس کے قائل نہیں ہیں۔

اور اگر اس سے بھی اصرح واوضح نص آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو خود علامہ شامی کی حانوتی سے نقل کردہ عبارت ملاحظہ کریں:

قال ابن عابدين سئل الحانوتی عن بيع الذهب بالفلوس نسيئة فأجاب بأنه يجوز إذا قبض أحد البدلين لما فی البزازية لو اشتری مائة فلس بدرهم يكفی التقابض من أحد الجانبين قال ومثله مالو باع فضة أو ذهبا بفلوس كما فی البحر عن المحيط. الخ.

سید محمد امین الدین بن عابدین شامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا: امام حانوتی سے پیسوں کے عوض سونا ادھار بیچنے کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا جائز ہے بشرطے کہ بدلین میں سے ایک پر قبضہ کر لیا گیا ہو جیسا کہ بزازیہ میں ہے اگر ایک درہم کے بدلے سو پیسوں کو خریدا تو صرف ایک جانب سے قبضہ کافی ہے اور کہا اگر کسی نے چاندی یا سونے کو پیسوں کے عوض فروخت کیا تو اس کا حکم بھی یہی ہے۔ بحر میں محیط سے یہی منقول ہے۔ الخ۔ (۱)

یہ تھیں وہ روشن تصریحات جن سے وہم کا غبار چھٹ گیا اور حق کا چہرہ صبح روشن کی طرح نکھر گیا۔

﴿۳﴾

گواہ کے قول: "حضرت عند فلان" سے ادائیگی شہادت کیوں نہیں ہو گی؟ اس کی صحیح علت کا انکشاف اور فقہائے سلف پر تطفل

قوت ترجیح کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

معین الحکام میں ہے:

---

(۱) فتاویٰ رضوية، ۷/ ۲۵٦.

إذا قال الحاكم للشاهد بأی شيء تشهد؟ فقال حضرت عند فلان فسمعته يُقرّ بكذا، أوأشهدنی على نفسه بكذا، أو شهدت بينهما بصدور البيع أو غير ذلك من العقود لايكون أداء شهادة ولايجوز للحاكم الاعتماد على شيء من ذلك.اهـ.

جب حاکم نے گواہ سے کہا: توکس چیز کی گواہی دیتا ہے ؟ تواس شخص نے جواب دیا میں فلاں شخص کے پاس حاضر تھا اور میں نے اسے ان چیزوں کا اقرار کرتے ہوئے سنا یا یہ کہا کہ اس نے مجھے ان چیزوں کا اپنے اوپر گواہ کیا یا یہ کہا کہ میں نے ان دونوں کے درمیان بیع صادر ہونے کی گواہی دی یا اس کے علاوہ کسی عقد کی تو یہ شہادت کی ادائگی نہ ہوگی اور نہ ہی حاکم کو ان میں سے کسی پر اعتماد کرنا جائز ہوگا۔(ت)

مذکورہ بالا روایت میں اس کا ذکر ہے کہ حاکم نے گواہ سے پوچھا تم کس چیز کی گواہی دیتے ہو تو اس نے کہا میں فلاں کے پاس حاضر تھا اور اسے ایسا ایسا اقرار کرتے ہوئے سنا یا اس کے علاوہ عبارت میں مذکور دوسرے کلمات کہے تو اس بارے میں فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ اس طرح شہادت کی ادائگی نہ ہوگی اور نہ ہی حاکم کو اس طرح کے بیان پر اعتماد جائز ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس طریقے پر ادائگی شہادت کیوں نہیں ہوگی ؟ اس کی وجہ کیا ہے ؟ جب کہ ایک جملہ میں أشهدنی على نفسه بكذا اور دوسرے میں شهدت بينهما بصدور البيع کلمۂ شہادت بھی موجود ہے، تو اس کی علت امام احمد رضا قدس سرہ نے جو بیان فرمائی وہ بہت ہی بہتر اور دل پذیر ہے، اور بعض دوسرے لوگوں نے اس کی علت آپ کی ذکر کردہ علت کے برخلاف بیان کی ہے۔

اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

ہمارے نزدیک اس کی بہتر تعلیل یہی ہے کہ "حضرتُ عند فلان" شہادت و مشہود بہ میں فاصل ہوگیا۔

ولا محل لأن يقال لم يقل أشهد لأ ن السؤال معادفی الجواب

ولذا لم يَبنِه عليه العلامة الطرابلسی وإنما علله بأنه خبر عن ماض ويحتمل التغير.اهـ.[1]

اس طریقے پر شہادت کی عدم ادائگی کی جو علت اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بیان فرمائی وہ یہ ہے کہ حضرتُ عند فلان کا کلمہ، شہادت اور مشہود بہ کے درمیان فاصل ہوگیا وہ اس طور پر کہ جب حاکم نے اس سے پوچھا "بأي شيء تشهد "تو اس نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ میں فلاں کے پاس حاضر تھا اور اسے اس کا اقرار کرتے ہوئے سنا تو جس چیز کا قرار کرتے ہوئے سنا وہ مشہود بہ ہوئی اور شہادت معنوی طور پر جواب میں پائی گئی اس لیے کہ سوال جواب میں ملحوظ ہوتا ہے تو حاکم نے تشہد کے لفظ سے سوال کیا تو گویا کہ جواب بھی شہادت ہی سے شروع ہوا لیکن فصل کی وجہ سے یہ شہادت ادائگی کی منزل کو نہ پہنچ سکی۔

چوں کہ بعض ذہنوں میں یہ خلجان ہو سکتا تھا کہ اس کی وجہ وہ نہیں جو آپ نے بیان کی بلکہ یہ ہے کہ مجیب نے "أشهد" کا کلمہ نہیں ادا کیا، تو اعلیٰ حضرت نے خود ہی اس الجھن کو دور فرمادیا۔

علامہ طرابلسی نے فرمایا: عدم ادائے شہادت کی علت یہ ہے کہ اس میں ماضی کی خبر دینا ہے جس میں تغیر کا احتمال ہے، اس تعلیل و توجیہ پر امام احمد رضا قدس سرہ نے متعدّد وجوہ سے کلام فرما کر اس کا رد بلیغ فرمایا، اور کہا کہ ماضی کے لفظ سے شہادت دینے کو اگر اس کی وجہ قرار دیا جائے تو اس سے بے شمار فروع کو رد کرنا لازم آئے گا جن میں ماضی کے لفظ سے شہادت دی گئی اور ملک فی الحال مراد لی گئی ہے جیسا کہ اس کی تفصیل آئندہ سطور میں اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے پیش فرمائی ہے:

أقول: وفيه نظر ويرده فروع جمة لا تحصر قال فی جامع الفصولين (مش) لو شهدا أنه كان ملكه فكأنما شهدا أنه ملكه فی الحال ولا يجوز للقاضی أن يقول **امروز ملک وے دانید** فعلی هذا

(۱) الفتاوی الرضوية:۷/ ۵۷۱ الرسالة: الهبة الأحمدية.

لوادعی دینا وشهدا أنه كان له عليه كذا أوقالا او را ایں قدر زردر ذمہ ایں بود ینبغی أن تقبل كما فی العین.

میں کہتا ہوں: ماضی والی وجہ محل نظر ہے، بے شمار مسائل اس کو رد کرتے ہیں، جامع الفصولین میں فرمایا: اگر دونوں گواہوں نے اس بات کی گواہی دی کہ یہ اس کی ملک تھی تو گویا فی الحال ملک ہونے کی گواہی دی، اور قاضی کو یہ حق نہیں کہ وہ شاہدوں سے یہ کہے کہ کیا آج اس کی ملک جانتے ہو؟ اسی بنیاد پر اگر مدعی دین کا دعویٰ کرے اور گواہان شہادت دیں کہ اس کا دین مدعاعلیہ کے ذمے تھا یا یوں کہیں اتنی مقدار زر اس کے ذمہ تھی تو گواہی قبول کی جائے گی جیسا کہ عین میں گواہی مقبول ہوتی ہے۔

طحطاوی میں ہے:

لوشهد أحد هما أنه ملكه والآخر أنه كان ملكه تقبل شهادتهما لاتفاقهما أنه له فی الحال معنی لما مر وكذا الشهادة علی النكاح والإقرار به .

ایک گواہ نے کہا یہ اس کی ملک ہے اور دوسرے نے کہا یہ اس کی ملک تھی تو دونوں کی گواہی قبول کی جائے گی کیوں کہ معنوی طور پر دونوں کا اتفاق ہے کہ یہ فی الحال اس کی ملک ہے جیسا کہ گزرا، یوں ہی نکاح اور نکاح کے اقرار کا معاملہ ہے۔(ر)

مذکورہ بالا دونوں عبارتوں سے یہ ثابت ہوا کہ گواہوں نے اگر لفظ ماضی کے ساتھ گواہی دی کہ اس کی ملک تھی تو یہ اس کی فی الحال گواہی مانی جائے گی اور قاضی حال کی گواہی مانتے ہوئے فیصلہ کرے گا۔

امام احمد رضا قدس سرہٗ السامی دونوں عبارتوں سے بھی زیادہ صریح عبارت پیش فرما رہے ہیں جس سے علامہ طرابلسی کی بیان کردہ علت بے معنی اور عبث ہو کر رہ جاتی ہے۔ فرماتے ہیں:

وفی الدرر والغرر و تنویر الابصار والدرالمختار:

ادعی الملك فی الحال وشهد الشهود ان هذا العین كان

ملكه تقبل لأن ماثبت في زمان يحكم ببقائه مالم يوجد المزيل. اهـ. فالوجه في تعليله ماذكرنا وبالله التوفيق.[1]

درر، غرر، تنویر الابصار ار اور در مختار میں ہے، اگر مدعی نے حالیہ ملکیت کا دعوی کیا اور گواہوں نے یہ گواہی دی کہ یہ اس کی ملک تھی تو گواہی مقبول ہوگی کیوں کہ جب کوئی چیز ایک زمانہ میں ثابت ہوگئی تو اس کی بقا کا حکم دیا جائے گا جب تک کسی زائل کرنے والی شَے کا ثبوت نہ ہوجائے۔ پس اس کی تعلیل میں صحیح وجہ وہی ہے جو ہم نے بیان کی، اور اللہ عزوجل کی جانب سے ہی توفیق ہے۔

ان تصریحات سے امام احمد رضا قدس سرہ کی فقیہانہ شان، اصول و فروع پر گہری نظر اور ژرف نگاہی کا روشن ثبوت فراہم ہوتا ہے اور یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ فقہ کے جن باریک گوشوں کی طرف آپ کے پیش رو فقہا کی نظر نہیں پہنچ سکی تھی آپ کی نگاہ دور بیں وہاں تک پہنچ گئی اور ان کی فروگذاشتوں پر تنبیہ بھی فرمائی، تاکہ بعد میں آنے والوں کو کم از کم صحیح علت اور صحیح وجہ معلوم ہو سکے۔

کثیر جزئیات کی فراہمی

کثیر جزئیات کی فراہمی، مسائل کی تقویت و تائید کا باعث ہوتی ہے جو وسعت مطالعہ اور دقت نظر کی متقاضی ہے، فتاوی رضویہ میں اس کے شواہد بکثرت ہیں۔ چند ملاحظہ ہوں:

﴿۱﴾

مذہب مختار پر ایجاب و قبول دونوں کفالت کے رکن ہیں

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ نے رکن کفالت کے بارے میں جو تحریر فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے امام اعظم ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہا اللہ کے

---

(۱) الفتاوی الرضوية، ص:۷/ ۵۷۱ .

مذہب مفتی بہ پر ایجاب و قبول دونوں کفالت کے رکن ہیں، اگر مکفول لہ مجلس ایجاب میں حاضر نہ ہوا اور اسی مجلس میں قبول نہ پایا گیا تو کفالت باطل محض اور بے اثر ہو جاتی ہے کہ اس کے بعد اگر مکفول لہ کو خبر پہونچی اور اس نے قبول بھی کر لیا جب بھی کفالہ اصلا مفید نہیں، اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا قول ثانی یہ ہے کہ ایسا کفالہ جائز ہے۔

اس مسئلہ کی تائید و توثیق میں اعلیٰ حضرت نے جزئیات کے انبار لگا دیے ہیں چند صریح جزئیات ذیل میں ملاحظہ کریں:

(۱) خلاصہ میں مبسوط امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منقول ہے: إذا كفل رجل لرجل والمكفول له غائب فهو باطل وقال أبو يوسف آخرا هوجائز. [1] جب کوئی شخص کسی دوسرے کے لیے کفیل بنے اور مکفول لہ غائب ہو تو یہ باطل ہے، اور امام ابو یوسف کا قول ثانی یہ ہے کہ جائز ہے۔

(۲) قدوری اور ہدایہ میں ہے: "لا تصح الكفالة إلا بقبول المكفول له فى المجلس" مکفول لہ نے اگر مجلس میں کفالت قبول نہیں کی تو کفالہ صحیح نہیں۔

(۳) بزازیہ میں ہے: إذاكان المكفول له غائبا فهى باطلة خلافا للثانى، جب مکفول لہ غائب ہو تو کفالہ باطل ہے برخلاف امام ثانی ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے۔

(۴) جامع الفصولین والنقرویہ میں ہے: لا تصح الكفالة بلا قبول الطالب. مجلس عقد میں طالب کے قبول کیے بغیر کفالہ صحیح نہیں۔

(۵) تنویر الأبصار میں ہے: لا تصح الكفالة بلا قبول الطالب فى مجلس العقد. مجلس عقد میں طالب کے قبول کیے بغیر کفالہ صحیح نہیں۔

(۶) منح الغفار میں امام طرطوسی سے نقل ہے: الفتوى على قولهما.

(۷) سراجیہ میں ہے: إذاقال لقوم: اشهدوا أنى كفيل لفلان

---

(۱) الفتاوی الرضویة، ج:۷ ،ص:۲۶۷-۲۶۸ كتاب الكفالة مطبع رضا اكیڈمی، ممبئی.

بنفس فلان والمكفول به حاضر والطالب غائب فالكفالة باطلة فإن قبل إنسان عنه توقف على إجازته.

(۸) ہندیہ میں محیط سے ہے: ركنها الإيجاب والقبول عند أبي حنيفة و محمد وهو قول أبي يوسف أولا حتى أن الكفالة لاتتم بالكفيل وحده سواء كفل بالمال أو بالنفس مالم يوجد قبول المكفول له أو قبول الأجنبي عنه في مجلس العقد أما إذا لم يوجد شيء من ذلك فلا تقف على ماوراء المجلس حتى لو بلغ الطالب فقبل لم تصح. اهـ .مختصراً.

مذکورہ جزئیات کی روشنی میں اعلیٰ حضرت نے یہ ثابت فرمایا کہ مجلس ایجاب سے اگر مکفول لہ غائب ہو تو کفالہ باطل ہو جاتا ہے ہاں اگر دوسرے نے مکفول لہ کی جانب سے قبول کر لیا تو یہ قبول مکفول لہ کی اجازت پر موقوف ہو گا۔

﴿۲﴾

کسی بھی کافر کو کسی مسلمان پر شرعی ولایت حاصل نہیں، حکم مذکور پر پندرہ جزئیات کی فراہمی

مسئلہ: کسی بھی کافر کو کسی مسلمان پر شرعی ولایت حاصل نہیں۔

کسی بھی کافر کو خواہ وہ بادشاہ وقت ہو یا والیِ ریاست، کسی بھی مسلمان آدمی پر شرعی ولایت حاصل نہیں ہے یعنی کافر کو مسلمان کے دینی و مذہبی معاملات میں کوئی ولایت و اختیار نہیں ہے اس مسئلے کو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہٗ نے کتب فقہ کے کثیر جزئیات سے روشن فرمایا ہے، ذیل کی سطور میں اس کو ملاحظہ فرمائیں۔

(۱-۲) حلبي على الدر پھر شامی میں ہے:

الكافر لايلي على ولده المسلم لقوله تعالیٰ: وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا. (النساء، آیت:۱۴۱)

کافر اپنی مسلمان اولاد کا ولی نہیں ہو گا اس لیے کہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے، اور

ہر گز اللہ مومنوں پر کافروں کو کوئی راہ نہیں دے گا۔ (راقم)

(۳-۶) نہایہ پھر عالم گیری پھر طحطاوی پھر ابن عابدین میں ہے:

تقليد الذمى ليحكم بين أهل الذمة صحيح لابين المسلمين وكذلك التحكيم.اهـ.

ذمی کا تقرر ذمیوں میں فیصلہ کرنے کے لیے صحیح ہے، مسلمانوں میں فیصلہ کرنے کے لیے نہیں اور ثالثی کا بھی یہی حکم ہے۔

(۷) تنویر الابصار میں ہے:

لوحكّما عبدافعتق أو صبيا فبلغ أوذميا فأسلم ثم حكم لا ينفذ.

اگر فریقین نے کسی غلام کو ثالث بنالیا پھر وہ غلام آزاد ہو گیا یا نابالغ بچہ کو بنایا اور وہ بالغ ہو گیا یا کسی ذمی کو بنایا اور وہ مسلمان ہو گیا پھر اس نے فیصلہ کیا تو نافذ نہیں ہو گا۔ (ر)

(۸) در مختار کتاب الشہادات میں ہے:

شرطها الولاية فيشترط الإسلام لو المدعى عليه مسلما.اهـ .

(۹) اور کتاب القضایا میں ہے أهله أهل الشهادة و شرط أهليتها شرط أهليته فإنّ كلا منهما من باب الولاية.[1]

شہادت کی شرط ولایت ہے اگر مدعا علیہ مسلمان ہے تو گواہ کا مسلمان ہونا شرط ہے۔

مدعا علیہ مسلمان ہو تو گواہ کا مسلم ہونا اس لیے شرط ہے کہ شہادت باب ولایت سے ہے اور گواہ کے کافر ہونے کی صورت میں مسلمان پر کافر کی ولایت لازم آئے گی اس لیے شاہد کے اسلام کی شرط رکھی گئی۔ (راقم)

(۱) الفتاوى الرضوية، ج:۷ ،ص:٤٩٥.

در مختار کتاب القضایا میں ہے: قاضی ہونے کا اہل وہی ہوگا جو شاہد ہونے کا اہل ہے اور شہادت کی اہلیت کی شرط قضا کی اہلیت کے لیے بھی ہے اس لیے کہ شہادت اور قضا دونوں ولایت کے باب سے ہیں۔

(۱۰) ہدایہ میں ہے:

لا ولاية لكافر على مسلم لقوله تعالى. وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (النساء، آیت:۱۴۱) [1]

کسی کافر کو کسی مسلمان پر کوئی ولایت نہیں یہاں ولایت سے ولایت شرعیہ مراد ہے، عرفیہ دنیویہ نہیں کہ یہ ولایت ہو سکتی ہے جیسا کہ اس کا روشن ثبوت گزرا۔ (ر)

(۱۱) ہدایہ کی کتاب الشہادات میں ہے:

لاتقبل شهادة الذمي على المسلم لإنه لاولاية له بالإضافة إليه .اهـ. مسلم کے خلاف ذمی کی شہادت مقبول نہیں کیوں کہ مسلمان پر اس کو کوئی ولایت نہیں۔

(۱۲) مختصر امام قدوری میں ہے:

لاتصح ولاية القاضى حتى يجتمع فى المولّٰى شرائط الشهادة. قاضی کی ولایت اس وقت صحیح نہ ہوگی جب تک اس میں شہادت کی شرطیں نہ پائی جائیں، (اور وہ اسلام، عقل، بلوغ اور حریت ہیں) (ر)

(۱۳) ہدایہ کتاب ادب القاضی میں ہے:

لأن حكم القضاء يستقى من حكم الشهادة لأن كل واحد منهما من باب الولاية فكل من كان أهلا للشهادة يكون أهلا للقضاء وما يشترط لأهلية الشهادة يشترط لأهلية القضاء.

کیوں کہ قضا کا حکم شہادت کے حکم سے مستفاد ہے اس لیے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک ولایت کے باب سے ہے تو جو قضا کا اہل ہوگا وہ شہادت کا بھی اہل ہوگا اس

---

(۱) الفتاوى الرضوية، ج:۷ ،ص:۴۹۵.

لیے کہ شہادت کی اہلیت کے لیے وہی شرط ہے جو قضا کی اہلیت کے لیے شرط ہے۔(ر)

(۱۴)فتاوی امام قاضی خان میں ہے:

لاولاية للصبي والمجنون ولاالمملوك ولاالكافر على المسلم.اهـ .

نابالغ، مجنون، غلام، اور کافر کو مسلمان پر ولایت نہیں۔

(۱۵) بدائع ملك العلماء مسعود کاسانی میں ہے:

لا شهادة للكافر على المسلم أصلا، مسلم کے خلاف کافر کی شہادت مقبول نہیں۔ یہ گیارہ کتابوں کے پندرہ جزئیات تھے جو اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ نے ایک مسئلہ کے ثبوت و تائید میں نقل فرمائے اور بخوبی واضح فرمادیا کہ کافر کو مسلمان پر شرعی ولایت نہیں ہو سکتی ان کتابوں میں بعض متون، بعض شروح اور بعض فتاویٰ ہیں اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ فقہ کے جزئیات اعلیٰ حضرت کو کس قدر مستحضر تھے اور ان کا مطالعہ کس قدر وسیع تھا اور قلب کس درجہ ثابت تھا اور اس پر مستزاد قوت اخذ و استنباط۔

﴿۳﴾

بیع و شرا اور طلاق و عتاق وغیرہ مسائل میں شاہدین کے اختلافِ زمان و مکان کے باوجود شہادت مقبول ہوگی، اکیس جزئیات سے حکم مذکور کی تائید

بیع، شرا، طلاق، عتاق، وکالت، وصیت، رہن، دین، قرض، ابرا، کفالہ، حوالہ، قذف، انشا اور محض اقرار قولی میں جب گواہوں کا اختلاف زمان (وقت) یا مکان (جگہ) میں ہو تو شہادت مقبول ہوگی، یہ اختلاف گواہی مقبول ہونے کے لیے مانع نہ ہوگا مثلاً ایک شاہد نے کہا آج طلاق دی اور دوسرے نے کہا کل، تو طلاق ثابت ہے اور شہادت مقبول ہے، اس حکم کی تائید میں اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ والرضوان نے فقہ کی درجنوں

کتابوں کے حوالے درج کیے اور کثیر جزئیات کی روشنی میں اس کا حکم واضح فرمایا، لیجیے آپ بھی اس سے اپنے قلب و جگر کو مستنیر کیجیے، آپ فرماتے ہیں:

علما تصریح فرماتے ہیں کہ اگر ایک شاہد نے کہا آج طلاق دی دوسرے نے کہا کل تو طلاق ثابت ہے اور شہادت مقبول۔

(۱-۴) بحرالرائق واشباہ والنظائر و زواہر الجواہر و درمختار وغیرہا میں ہے:

قال أحدهما طلقها اليوم والآخر إنها طلقها أمس يقع الطلاق. *ایک گواہ نے کہا اس نے بیوی کو آج طلاق دی ہے اور دوسرے نے کہا کل، تو طلاق ہو جائے گی۔*

(۵- ۱۱) فتاوی صغری و فصول عمادی وخزانة المفتين و جامع الفصولين و غاية البيان وفتاوی انقرویه وردالمحتار آخر الوقف میں ہے۔

لو اختلف الشاهدان فی زمان أومكان أوإنشاء أوإقرار أوكان هذا الاختلاف فی قول محض كبيع و طلاق وإقرار وإبراء لايمنع القبول.[1]

اگر دونوں گواہوں کا اختلاف زمان یا مکان یا انشا یا اقرار میں ہوا یا یہ اختلاف ایسے معاملے میں ہوا جس کا تعلق محض قول اور کلام سے ہے جیسے: بیع، طلاق، اقرار اور ابرا تو یہ قبولیت کے لیے مانع نہ ہوگا۔ (ر)

(۱۲- ۱۵) خلاصہ و جامع الفصولین و بحر الرائق و انقرویہ میں ہے:

الاختلاف فی زمان أو مكان أوإنشاء و إقرار فی القول المحض لايمنع قبولها مطلقا. اھ. مختصرا.

زمانہ، جگہ، یا انشا و اقرار، قول محض میں اختلاف قبول شہادت کے لیے

---

(۱) الفتاوی الرضوية، ج:۷ ص:۵٤٩.

مطلقاً مانع نہیں۔

(۱۶- ۱۸) کافی ولسان الحکام وبحرالرائق میں ہے:

إذااختلف الشاهدان فى الزمان أوالمكان فى البيع والشراء و الطلاق والعتاق والوكالة والوصية والرهن، والدين والقرض والبراءة والكفالة والحوالة والقذف تقبل.

بیع، شرا، طلاق، عتاق، وکالت، وصیت، رہن، دین، قرض، براءت، کفالہ، حوالہ اور قذف میں جب گواہوں کا اختلاف زمان یا مکان کے بارے میں ہو تو شہادت مقبول ہوگی۔

(۱۹) معین الحکام میں ہے:

لوشهدا بالخلع أوالبيع أوالهبة أو الصدقة أوالرهن أوالصلح واختلفا فى المكان أو الزمان قبلت.

اگر دونوں گواہوں نے خلع، بیع، ہبہ، صدقہ، رہن یا صلح سے متعلق گواہی دی اور زمان ومکان میں دونوں مختلف ہوگئے تو گواہی قبول کی جائے گی۔

(۲۰-۲۱) جامع الفصولین والنقرویہ میں اختلافِ تاریخ کے بارے میں ہے:

الاختلاف فى القول لايمنع. قولی معاملہ میں تاریخ کا اختلاف قبول شہادت کے لیے مانع نہیں۔

مذکورہ حکم کے اثبات میں اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے کتابوں کے اکیس جزئیات کے حوالے پیش فرمائے جن میں فقہ وفتاویٰ کی باضابطہ پندرہ کتابوں کی نشان دہی فرمائی اور کتابیں بھی اتنی مستند ومعتبر کہ کتب فقہ وفتاوی میں انھیں امتیازی مقام حاصل ہے ان میں بعض کتابیں تو ایسی ہیں مثلاً زواہر الجواہر، فتاویٰ صغری، فصول عمادی، جامع الفصولین، غایۃ البیان، فتاوی النقرویہ، کافی، لسان الحکام، و معین الحکام وغیرہا جن تک بڑے بڑے مفتیوں کی ہمارے زمانے میں نگاہ نہیں پہنچ پاتی اور اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو ان کتابوں کے عام سے عام جزئیات بھی مستحضر اور نوک قلم پر تھے،

یہ مبالغہ نہیں بلکہ اس کو بالغ نظر ذی فہم قاری بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ جب ان کا قلم چلتا تو چلتا ہی رہتا کہ یہ جزئیہ فلاں فلاں کتابوں میں ہے اور درجنوں کتب کا حوالہ دے دیتے، جیسا کہ ایک مقام پر فرمایا:

فتاوی صغری، فصول عمادی، خزانۃ المفتین، جامع الفصولین وغایۃ البیان وفتاوی انقرویہ وردالمحتار آخر الوقف میں ہے۔ (۱)

اسی طرح ایک مقام پر فرمایا: بحر الرائق و اشباہ والنظائر و زواہر الجواہر و در مختار وغیرہا میں ہے، اس اسلوب بیان سے قاری بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ یہ تمام حوالہ جات آپ قلم برداشتہ زبانی اپنے خداداد حافظہ پر اعتماد کرتے ہوئے دے رہے ہیں یہ ہے اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کے ضبط واستحضار کا عالم اور وسعت نظر کی ہمہ گیری۔

مراجع اور حوالوں کی کثرت

کسی بھی مسئلہ کو ثابت کرنے اور محکم بنانے کے لیے دلائل کی ضرورت پیش آتی ہے اور دلائل کی تقویت کے لیے حوالوں کی کثرت بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے، امام اہل سنت اعلیٰ حضرت کی وہ امتیازی شان ہے کہ بعض اوقات قلم برداشتہ دسیوں، بیسیوں یہاں تک کہ پچاسوں کتابوں کے حوالے اور ان کی عبارات نقل فرمادیتے ہیں یہ آپ کی وسعت مطالعہ اور فقہی تبحر پر روشن دلیل ہے، آپ کے رسائل اور فتاوے اس طرح کی مثالوں سے مملو ہیں، ذیل میں اس تعلق سے چند شواہد نذر قارئین ہیں۔

﴿۲﴾

روپیہ خردہ (چینجز) کرانے والے کے وہاں کچھ ادھار چھوڑ دینا جائز ہے، دس کتبِ فقہ سے جواز کی تصریحات

اعلیٰ حضرت قدس سرہ سے سوال ہوا کہ ایک شخص نے بقال (سبزی فروش) کو

---

(۱) الفتاوی الرضویة، ج:۷، ص:٤٩٥ طبع رضا اکادیمی.

ایک روپیہ دیا کہ اس کے عوض پیسے دے دے، بقال نے آٹھ آنے دیے اور کہا کہ آٹھ آنے کل دوں گا، آیا یہ چھوڑ دینا گناہ ہے یا نہیں؟

اس کے جواب میں اعلیٰ حضرت نے فرمایا: اس صورت کے جواز میں روایات مختلف ہیں لیکن اکثر معتبرات مثلاً: (۱) تنویرا لابصار (۲) در مختار (۳) فتاوی بزازیہ (۴) مبسوط (۵) محیط (۶) ذخیرہ (۷) بحر الرائق (۸) نہر الفائق (۹) فتاوی علامہ حانوتی اور (۱۰) فتاوی ہندیہ وغیرہ میں جواز پر جزم فرمایا تو بہتر بچنا ہے، خروجا عن الخلاف، اختلاف سے بچنے کے لیے، اور اگر ایسا کرے تو کچھ گناہ بھی نہیں اس لیے کہ عام علما کا میلان جواز ہی کی جانب ہے۔[1]

اس مختصر سی عبارت میں اعلیٰ حضرت نے مسئلہ کا حل بھی پیش فرمایا اور ساتھ ہی دس کتابوں کے حوالے سے راجح صورت اور مفتی بہ قول کو مؤید بھی فرمایا۔

﴿۲﴾

قول مرجوع عنہ پر فتوی دینا اور فیصلہ کرنا جہل اور خرق اجماع ہے، اٹھائیس کتب فقہ سے اس پر روشن تصریحات

اعلیٰ حضرت فتاوی رضویہ جلد ہفتم میں فرماتے ہیں: امام ابو یوسف کی حکایت نادرہ کو ان کا مذہب قرار دینا فقاہت کے سخت خلاف ہے۔ نہ قاضی کو اس پر عمل کی اجازت، نہ مفتی کو اس پر فتوی دینا روا ہے، کیوں کہ علما اور ائمہ کی روشن تصریحات سے ثابت ہے کہ جو کچھ ظاہر الروایہ سے خارج ہے وہ ہمارے ائمہ کا مذہب نہیں، وہ تو قول مرجوع عنہ ہے اور قول مرجوع پر فتوی دینا اور فیصلہ کرنا جہل اور خرق اجماع ہے۔ یہ حکم قول مرجوع کا ہے اور مرجوع عنہ ہو تو سرے سے قول ہی نہ رہا۔ اسے لینا کس قدر جہل عظیم ہے۔

اس کی تائید میں اعلیٰ حضرت نے فقہی کتابوں سے کثیر جزئیات نقل فرما کر مسئلہ

---

(۱) الفتاوی الرضویۃ ج:۷، ص:۲۵۲، باب الصرف.

کو روشن و منور کر دیا مختلف اصول وضوابط سے اس کو ثابت فرمایا۔

(۱) ردالمحتار میں ہے: قد صرحوا بأن العمل بما علیه الأکثر فقہا نے صراحت فرمائی کہ عمل اس قول پر ہے جس پر اکثر لوگ ہیں۔

(۲) شرح أشباه للعلامة البیری(۳) اور عقودالدریه میں ہےالمقرر عندالمشایخ أنه متی اختلف فی مسئلة فالعبرة بما قاله الأکثر، مشائخ کے یہاں یہ بات ثابت ہے کہ جب کسی مسئلہ میں اختلاف ہوجائے تو اکثر کے قول کا اعتبار ہے۔

(۴) امداد الفتاوی علامہ شرنبلالی میں ہے: القاعدة العمل بما علیه الأکثر.

(۵)تنویرالابصار(۶)در مختار (۷)منیہ (۸)اور سراجیہ وغیرہا میں ہے: یاخذ القاضی کالمفتی بقول أبی حنیفة علی الإطلاق.

(۹)ثلثۂ اخیرہ میں ہے ھوالاصح.

(۱۰)خیریہ میں ہے: المقررایضا عندنا أنه لایفتی ولایعمل إلابقول الإمام (۱۱)ردالمحتار کتاب إحیاء الموات کے شروع میں ہےوذلك عجیب لما قالوا إن ماخالف ظاهر الروایة لیس مذهبا لأصحابنا.

(۱۲) بحر الرائق کتاب القضا میں ہے، ماخرج عن ظاهر الروایة فهو مرجوع عنه لما قرروه فی الأصول من عدم إمکان صدور قولین مختلفین متساویین من مجتهد والمرجوع عنه لم یبق قولا له، (۱۳)— (۱۴) تصحیح القدوری اور در مختار میں ہے: الحکم والفتیا بالقول المرجوح جهل و خرق للاجماع.

(۱۵) خیریہ اواخر شہادات میں ہے: هذا هو المذهب الذی لا یعدل عنه إلی غیره وما سواه روایات خارجة عن ظاهر الروایة وما خرج عن ظاهر الروایة فهو مرجوع عنه والمرجوع عنه لم یبق قولا له.

(١٦-١٨) حواشی ثلثہ سادات ثلثہ ابراہیم حلبی واحمد مصری ومحمد شامی میں ہے:
أولیٰ من ھٰذابالبطلان الإفتاء بخلاف ظاھر الروایة إذلم یصح الإفتاء بالقول المرجوع عنه.

(١٩-٢٠) تنویر و شرح علائی میں ہے: لایخیر إلا إذا کان مجتھدا بل المقلد متی خالف معتمد مذھبه لاینفذ حکمه وینقض ھوالمختار للفتوی.

ان کے علاوہ (٢١) مجمع، (٢٢) وقایه، (٢٣) ملتقیٰ، (٢٤)شرح وھبانیه للشرنبلالی. (٢٥)فتح القدیر (٢٦) برھان شرح مواھب الرحمٰن. (٢٧) غنیة ذوی الاحکام (٢٨)فتاوی علامہ قاسم بن قطلوبغا وغیرہا کتب کی عبارات سے ثابت فرمایا کہ قول مرجوح یا مرجوع عنہ یا ظاہر الروایہ کے خلاف پر فتوی دینا اور اس پر عمل کرنا جہالت اور خرق اجماع ہے۔ اس سے آپ کی وسعت مطالعہ اور استحضار جزئیات کا پتا چلتا ہے۔[1]

امام ابو یوسف کی روایت نادرہ کو ان کا مذہب قرار دینا فقاہت کے خلاف ہے۔ بائیس سے زیادہ کتب فقہ سے اس امر کا ثبوت

اسی طرح روایت نادرہ کو مذہب امام ابو یوسف کہنا کس قدر فقاہت کے خلاف ہے، اس کو آپ نے ٢٢؍ سے زیادہ کتب فقہیہ کے حوالے سے ثابت فرمایا ہے، آپ فرماتے ہیں:

روایت نادرہ ابی یوسف کو مذہب امام ابو یوسف کہنا کس قدر فقاہت کے خلاف ہے نہ قاضی و مفتی کو اس پر عمل و حکم کی اجازت۔ جامع صغیر و مبسوط امام محمد، بحر الرائق، واشباہ والنظائر، زواہر الجواہر و در مختار وفتاوی صغیریہ و فصول عمادی و خزانۃ المفتین وجامع الفصولین وغایۃ البیان وفتاوی انقرویہ وردالمحتار وفتاوی خلاصہ و کافی و

---

(١) الفتاوی الرضویة، ج:٧، ص:٥٥٥-٥٥٦.

لسان الحکام و معین الحکام و عقود الدریہ و وجیز کردری و فتاوی خانیہ و فتاوی ظہیریہ و فتاوی قاعدیہ و غیرہا کتب معتمدہ مذہب کی عبارات کثیرہ اوپر گزریں کہ اس روایت نادرہ کے سراسر خلاف ہیں اور انھیں پر انحصار نہیں عامۂ کتب مذہب میں اس کا خلاف موجود ہے۔[1]

﴿۳﴾

طلاق مغلظہ کا ایک اہم مسئلہ اور کثیر کتب فقہیہ سے مسئلہ دائرہ کی بھرپور وضاحت

ایک شخص نے اپنی بیوی ہندہ کو طلاق مغلظہ دی اور طلاق دینے کے بعد اس نے ایقاع طلاق کا انکار کیا، ہندہ نے اس پر چار مردوں اور دو عورتوں کی گواہی عدالت کے سامنے پیش کی ان کی گواہی کا خلاصہ یہ ہے:

أشهد بالله ہم گواہی دیتے ہیں کہ ۲۶-۲۷ دن کا عرصہ ہوا خالی کا مہینہ تھا یعنی ذی قعدہ کا، ساتویں تاریخ تھی، بدھ کا دن تھا، دن کے آٹھ بج رہے تھے کہ عباس علی خان نے اپنی زوجہ ہندہ کو تین طلاقیں دیں، اس کے بعد عدالت نے ہندہ کے دعویٰ کو بے اصل اور گواہوں کی شہادت کو غیر مقبول قرار دیا اور مقبول نہ ہونے کی وجہ یہ بتائی کہ تاریخ میں جہالت پائی جارہی ہے۔

اس پر اعلیٰ حضرت نے مسئلہ کا حکم واضح فرمایا کہ صورت مستفسرہ میں اگر دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ثقہ عادل شرعی ہیں اور انھوں نے شہادت بروجہ شرعی ادا کی تو طلاق کا دعوی ضرور ثابت ہے اور مدعیہ کے حق میں فیصلہ کرنا واجب، رہی یہ بات کہ گواہوں کے ۲۶-۲۷ کہنے کو جہالت تاریخ قرار دیا یہ تو سخت عجیب و غریب ہے اس لیے کہ یہاں صراحۃً تاریخ دن ماہ اور وقت سب کی تعیین ان کے کلام میں مذکور ہے، علما تصریح فرماتے ہیں: ایک شاہد نے اگر آج طلاق دینے کا قول کیا اور دوسرے نے

(۱) الفتاوى الرضوية، ج:۷، ص:۵۵۵.

کل کا تو طلاق ثابت ہے اور شہادت مقبول ہے۔ بحر الرائق ، اشباه والنظائر، زواھرالجواھر، درمختار وغیرہا کتب میں ہے ، قال احدھما: طلقها اليوم والآخر أنه طلقها امس يقع الطلاق ، گواہوں میں سے ایک نے کہا فلاں نے آج اس کو طلاق دی اور دوسرے نے کہا کل طلاق دی تو طلاق واقع ہو جائے گی، فتاویٰ صغری، فصول عمادی، خزانة المفتين، جامع الفصولين، غاية البيان، فتاویٰ انقرویه اور ردالمحتار کتاب الوقف کے اخیر میں ہے:

لواختلف الشاهدان فى زمان أو مكان أو انشاء أو إقرار إن كان هٰذا الاختلاف فى قول محض كبيع وطلاق وإقرار وإبراء لايمنع القبول، اگر دو گواہ زمانہ یا مکان یا انشا یا اقرار کے بارے میں اختلاف کریں اور یہ اختلاف قول محض مثلاً بیع ، طلاق، اقرار یا ابرا میں ہو تو قبول سے مانع نہیں، خلاصہ، جامع الفصولين، بحرالرائق اور انقرویه میں ہے الاختلاف فی زمان أو مكان أو إنشاء أو إقرار فى القول المحض لايمنع قبولها مطلقا.اھ۔[1]

﴿۴﴾

عرفِ فقہا میں باطل و فاسد کا ایک دوسرے پر اطلاق شائع و ذائع ہے، دس سے زائد کتبِ فقہ سے اس کی وضاحت و توثیق

عرفِ فقہا میں باطل اور فاسد کے مفاہیم اگرچہ متعیّن ہیں کہ صلب اور ذات میں فساد ہو تو باطل اور وصف میں فساد پایا جائے تو فاسد کہلاتا ہے مگر انھیں کے عرف میں کبھی باطل کا اطلاق فاسد پر اور فاسد کا اطلاق باطل پر ہوتا ہے ، دونوں ایک دوسرے کی جگہ پر استعمال ہوتے ہیں: علامہ قہستانی باطل کے بیان میں فرماتے ہیں:

---

(۱) الفتاوى الرضوية، ج:۷، ص: ۵۴۹، مطبوعه، رضا اکیڈمی ممبئی.

كثيرا مايطلق الفاسد عليه وبالعكس .اھ۔ بکثرت باطل پر فاسد کا اور فاسد پر باطل کا اطلاق ہوتا ہے۔

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں: سب سے قوی دلیل اس پر امام ہمام فقیہ النفس فخر الدین قاضی خان کا کلام ہے اس لیے کہ انھوں نے خانیہ میں فرمایا: بیع کی چند قسمیں ہیں: باطل، فاسد، موقوف، لازم اور مکروہ۔ پھر بیع باطل کے بیان میں ایک فصل باندھی اور اس کے مسائل ذکر کیے، پھر بیع فاسد کے باب میں فرمایا: مفسد بیع کی چند قسمیں ہیں اور یہ باب چند فصلوں پر مشتمل ہے، فصل اول بدلین میں سے کسی ایک کی جہالت سے بیع کے فاسد ہونے کے بیان میں، اور بدلین کی جہالت سے بیع کے فساد کے مثالوں میں ان چیزوں کا ذکر فرمایا۔

وفيه الجمع بين الموجود والمعدوم والجمع بين الحل وغير الحل .اھ۔

موجود و معدوم، حلال اور غیر حلال کے درمیان جمع کرنا بیع فاسد ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے: اگر کسی نے کہا میں نے یہ بکری اور اس اونٹ سے جو بچہ پیدا ہوگا اس کو تمھارے ہاتھوں بیچا تو یہ بیع فاسد ہے اسی طرح کہا میں نے جانور اور اس کے حمل کی بیع کی تو یہ بیع فاسد ہے، حلال و حرام کو جمع کرنے کی مثال یہ ہے، بکری اور خنزیر کی بیع، آزاد اور اونٹ کی بیع، ان بیعوں کو انھوں نے بیع فاسد کے زمرے میں داخل کر دیا، جب کہ یہ ساری بیعیں باطل کے قبیل سے ہیں نہ کہ فاسد سے، لہٰذا اس سے بھی یہ سمجھ میں آیا کہ فاسد کا اطلاق باطل پر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ قاضی خان نے ایسا فرمایا۔

ان تفصیلات کے بعد اعلیٰ حضرت رقم طراز ہیں:

فهٰذا كما ترى نص صحيح لا يقبل صرفا ولا تاويلا قلت وبه أوضح عمدة المذهب إمامنا المجتهد سيد نا محمد فى المحيط والمبسوط وغيره فى غيرهما كما فى جامع الرموز والكفاية، وعليه يدور

كلام الإمام برهان الدين المرغيناني في الهداية، والعلامة المحقق على الإطلاق في الفتح والفاضل زين الدين المصري في الاشباه والسيد احمد الحموي في غمزالعيون، و العلامة نوح أفندي والفاضل السيد أحمد الطحطاوي وغيرهم رحمة الله تعالىٰ عليهم أجمعين فعليه المعوَّل و به الاعتماد.[1]

تو یہ جیسا کہ دیکھ رہے ہو صریح نص ہے جو مجاز اور تاویل کو قبول نہیں کرتا، میں کہتا ہوں اسی کو واضح فرمایا ہے عمدۃ المذہب (مذہب کے ستون) ہمارے امام مجتہد، ہمارے سردار محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے محیط اور مبسوط میں اور دیگر ائمہ نے دوسری کتابوں میں جیسا کہ جامع الرموز اور کفایہ میں ہے، اور اسی پر امام برہان الدین مرغینانی کا کلام ہدایہ میں دائر ہے، محقق علی الاطلاق کا کلام فتح القدیر میں، علامہ زین الدین کا اشباہ میں، سید احمد حموی کا غمز العیون میں، علامہ نوح آفندی اور سید احمد طحطاوی و غیرہم ائمہ کا کلام بھی۔ اللہ تعالیٰ ان سب پر رحمت نازل فرمائے۔ پس اسی پر بھروسا اور اسی پر اعتماد ہے۔

﴿۵﴾

ثمن خلقی کے عوض ثمن اصطلاحی کی بیع "بیع صرف" نہیں ہے، اس پر ایک درجن کتب فقہ کا حوالہ

بیع صَرف: یہ ہے کہ جو چیز ثمن ہونے کے لیے پیدا کی گئی ہے اسے ایسی ہی چیز کے ساتھ بیچیں اس کی یہ تعریف بحر الرائق اور در مختار وغیرہا میں کی گئی ہے۔ اس میں مجلس عقد ہی میں دونوں طرف کا قبضہ شرط ہے۔

دراہم کے بدلے نوٹ کی بیع صَرف نہیں کہلائے گی جیسے دراہم کے عوض پیسے کی بیع صَرف نہیں کہلاتی، اس لیے کہ پیسے اور نوٹ میں جو ثمنیت ہے وہ خلقی نہیں بلکہ

---

(۱) الفتاوى الرضوية، ج:۷، ص:۱۵ ، كتاب البيوع.

اصطلاح کے سبب عارض ہے، پس نوٹ کو درہموں کے بدلے ادھار بیچنا جائز ہے جب کہ دونوں میں سے کسی ایک پر مجلس ہی میں قبضہ پالیا جائے، ایک طرف کا قبضہ اس لیے شرط ہے کہ نوٹ اصطلاح اور چلن کے اعتبار سے ثمن ہے لہٰذا عدم قبضہ کی صورت میں بیع الکالی بالکالی، یعنی دین کے بدلے دین کو بیچنا لازم آئے گا جو حرام ہے۔لنهيه صلى الله تعالىٰ عليه وسلم عن بيع الكالى بالكالى.

یہ خلاصہ ہے اس کا جو اعلیٰ حضرت نے کفل الفقیہ الفاہم کے اندر سوال نمبر ۹/ کے جواب میں ارشاد فرمایا ہے، اس کے بعد لکھتے ہیں:

والمسئلة منصوص عليها فى مبسوط الإمام محمد واعتمده فى المحيط والحاوى والبزازيه والبحر والنهر وفتاوى الحانوتى والتنوير والهندية وغيرها وهو مفاد كلام الإسبيجابى كما نقله الشامي عن الزّين عنه.اهـ .[1]

مبسوط امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ میں اس مسئلے کی تصریح ہے اور اسی پر اعتماد کیا محیط ،حاوی، بزازیہ، بحر، نہر، فتاوی حانوتی، تنویر، اور ہندیہ وغیرہا میں اور یہی مفاد ہے کلام امام اسبیجابی کا جیسا کہ شامی نے بحوالہ بحر اُن سے نقل کیا۔

سطور بالا سے عیاں ہے کہ ثبوت میں اعلیٰ حضرت نے ایک درجن کتب فقہ کا حوالہ ارشاد فرمایا یہ آپ کے تبحر علمی، وسعت مطالعہ، دقت نظر، بے مثال شان تفقہ اور غیر معمولی استحضار پر بین دلیل ہے۔

﴿٦﴾

دراہم ودنانیر کو مرابحۃً بیچنا جائز نہیں، گیارہ کتب فقہ کا حوالہ

عقد مرابحہ میں جو شَے مرابحۃً بیچی جائے اس میں دو شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے۔

شرط اول یہ ہے کہ وہ شَے معین ہو یعنی عقد معاوضہ، اس کی ذات خاص سے

(۱) الفتاوى الرضوية، ج:۷، ص:۱٤۷ ، رساله "كفل الفقيه الفاهم".

متعلق ہونہ یہ کہ ایک مطلق چیز ذمہ پر لازم ہوتی ہو، ثمن جیسے درہم اور اشرفی یہ عقود معاوضہ میں متعیّن نہیں ہوتے۔

شرط دوم یہ ہے کہ وہ ایسا سودی مال نہ ہو جو اپنی جنس کے بدلے لیا گیا ہو مثلاً: سونا سونے کے بدلے وغیرہ۔

پس شرط اول سے یہ معلوم ہوا کہ اگر دراہم سے اشرفیاں خریدیں تو ان کو مرابحہ کے طور پر نہیں بیچ سکتے، اس مسئلے کی دلیل میں اعلیٰ حضرت رقم طراز ہیں:

كما نص عليه فى التبيين والفتح والعناية والكفاية والبحر والنهر والظهيرية والخانية وخزانة المفتين والهندية وجامع الرموز وغيرها وإن نقل "ط" عن حاشية سري الدين على الزيلعى نقلا عن البدائع أنه يجوز.[1]

جیسا کہ تبیین، فتح القدیر، عنایہ، کفایہ، بحر، نہر، ظہیریہ، خانیہ، خزانۃ المفتین، ہندیہ اور جامع الرموز میں اس کی صراحت ہے اگرچہ طحطاوی نے تبیین کے حاشیہ سری الدین سے بحوالہ بدائع نقل فرمایا ہے کہ یہ جائز ہے۔

یہاں دیکھیں صرف ایک مسئلہ کے ثبوت میں اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے بیک جنبش قلم گیارہ کتابوں کے حوالے پیش فرمائے کہ ان کتابوں میں اس کی صراحت ہے کہ دراہم و دنانیر کو مرابحۃً بیچنا جائز نہیں اس لیے کہ یہ عقود معاوضہ میں متعیّن نہیں ہوتے۔

﴿٧﴾

ثمن خلقی کے عوض ثمن اصطلاحی کی بیع میں تقابض بدلین شرط نہیں ہے، بارہ فقہی مراجع کا حوالہ

پیسوں کی بیع اگر دراہم یا دنانیر سے ہوتی ہے تو یہ بیع صرف نہیں کیوں کہ

---

(١) الفتاوى الرضوية، ج:٧، ص:٥٨، رضااکیڈمی، ممبئی.

"صرف" تو ثمن خلقی کو ثمن خلقی کے عوض بیچنے کا نام ہے جیسا کہ بحر، در مختار اور شامی وغیرہ میں ہے اور پیسوں پر ثمن کا حکم عارضی ہے جب تک وہ رائج ہیں اصطلاح ناس میں ثمن ہیں رواج ختم ہو جائے چلن بند ہو جائے تو یہ سامان ہیں جیسا کہ اصل خلقت میں تھے، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ جب تک ان کا چلن باقی ہے حکم اثمان ان کو عارض ہے لہٰذا جانبین میں سے کسی ایک پر قبض بالید ہونا ضروری ہے ورنہ دین کے بدلے دین سے افتراق ہوگا حالاں کہ رسول اقدس ﷺ نے ادھار کے بدلے ادھار کی بیع سے منع فرمایا ہے۔

اختلاف اس امر میں ہے کہ آیا جانبین سے قبضہ مشروط ہے یا ایک ہی جانب میں کافی ہے، اس سلسلے میں فقہا کی دو رائیں ہیں جس نے اصل خلقت پر نظر کی کہا یہ بیع صرف نہیں پھر جانبین سے قبضہ کی کیا حاجت، اس کے بعد اعلیٰ حضرت نے تحریر فرمایا:

وهم الأكثرون وعليه نص محمد فى المبسوط واعتمده فى المحيط والحاوى والبزازيه والبحر الرائق والنهر الفائق وفتاوى الحانوتى و تنوير الأبصار والدرالمختار والفتاوى الهندية وغيرها من متون ا لمذهب و شروحه وفتاواه وهو مفاد كلام الإسبيجابى كما نقله الشامى عن الزين عن الإمام.[1]

دونوں جانب سے قبضہ کی شرط نہ ماننے والے اکثر فقہا ہیں امام محمد نے مبسوط میں ا س کی صراحت فرمائی اور محیط، حاوی، بزازیہ، بحر، نہر، فتاوی حانوتی، تنویر، در مختار، فتاوی ہندیہ وغیرہ متون مذہب اور ان کی شروح و فتاوی میں اسی پر اعتماد کیا گیا ہے اور یہی امام اسبیجابی کے کلام کا مفاد ہے جیسا کہ شامی نے اس کو بحوالہ زین بن نجیم امام اسبیجابی سے نقل فرمایا ہے۔

اور جنھوں نے ثمنیت اصطلاحی ہونے کا لحاظ کیا انھوں نے تقابض کو شرط

---

(١) الفتاوى الرضوية، ج:٧ ،ص:٤٩٥.

ٹھہرایا، جیسا کہ علامہ قاری الہدایہ نے اسی پر فتوی دیا، مذکورہ اقتباس میں امام احمد رضا قدس سرہ نے بیک جنبشِ قلم ۱۲/ مراجع ومآخذ کا حوالہ پیش فرمادیا جو آپ کی وسعت نظر پر روشن دلیل ہے۔

﴿۸﴾

خط خط کے مشابہ ہوتا ہے لہٰذا اس پر اعتماد کرتے ہوئے قاضی کا فیصلہ کرنا جائز نہیں۔ کثیر جزئیات کا انبار

مسئلہ: خط خط کے مشابہ ہوتا ہے لہٰذا اس پر اعتماد کرتے ہوئے قاضی کا فیصلہ کرنا جائز نہیں۔

کیا قاضی اس بنا پر کسی کے خلاف فیصلہ صادر کر سکتا ہے کہ چند گواہوں نے مثلاً زید کے دستخط کسی رقعہ پر ہونے کی گواہی دی، لکھتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا بلکہ صرف دستخط کو پہچانا، اس بارے میں فقہائے کرام کا مذہب یہ ہے کہ قاضی کو اس پر اعتماد کرنا پھر مدعا علیہ کے خلاف فیصلہ صادر کرنا درست نہیں، اس ضمن میں چند جزئیات فقہ ملاحظہ فرمائیں۔

ہدایہ میں ہے: الخط يشبه الخط فلا يعتبر. خط خط کے مشابہ ہوتا ہے اس لیے معتبر نہیں فتح القدیر میں ہے: الخط لا ينطق وهومتشابه. خط بولتا نہیں حالاں کہ وہ دوسرے کے مشابہ ہے۔

در مختار میں ہے: "لا يعمل بالخط" خط پر عمل نہیں کیا جائے گا۔(ر)

فتاوی امام قاضی خان میں ہے: لا يصلح حجة لأن الخط يشبه الخط" خط حجت نہیں بن سکتا اس لیے کہ وہ ایک دوسرے کے مشابہ ہوتا ہے۔

نیز خانیہ میں ہے: أخرج المدعى خطا بإقرار المدعى عليه بذلك فأنكر أن يكون خطه فاستكتب وكان بين الخطين مشابهة ظاهرة لا يقضى به هو الصحيح.

مدعی نے مدعا علیہ کے اقرار کا خط پیش کیا تو مدعا علیہ نے اپنا خط ہونے کا انکار کیا پھر قاضی نے مدعا علیہ سے خط لکھوایا اور دونوں تحریروں کے درمیان کھلی ہوئی مشابہت تھی اس کے باوجود قاضی اس خط پر فیصلہ نہیں دے گا یہی صحیح ہے۔

الأشباه والنظائر میں ہے:

لایعتمد علی الخط ولایعمل به. خط پر نہ اعتماد کیا جائے گا نہ عمل۔

کافی شرح وافی میں ہے:

الخط یشبه الخط وقدیزوّر و یفتعل. خط خط کے مشابہ ہوتا ہے اور کبھی جھوٹا اور جعلی ہوتا ہے۔

عینی علی الکنز میں ہے:

الخط یشبه الخط فلا یلزم حجة لأنه یحتمل التزویر.اهـ.

خط چوں کہ ایک دوسرے کے مشابہ ہوتا ہے جھوٹا اور جعلی ہونے کا احتمال رکھتا ہے اس لیے اس کا حجت ہونا لازم نہیں۔

مجمع الأنهر شرح ملتقی الأبحر میں ہے:

الکتاب قدیزوّرویفتعل والخط یشبه الخط والخاتم یشبه الخاتم...[1]

مکتوب کبھی جھوٹا اور جعلی ہوتا ہے اور خط مشابہ خط ہوتا ہے اور مہر ایک دوسرے کے مشابہ ہوتی ہے۔

ظہیریہ و شرح الاشباہ للعلامۃ البیری و ردالمحتار کتاب القضا باب کتاب القاضی میں ہے:

لایقضی القاضی بذلك عند المنازعة لأن الخط مما یزوّر و یفتعل.

قاضی کسی نزاع میں خط پر فیصلہ نہ کرے اس لیے کہ خط جعلی اور من گھڑت ہو

(۱) الفتاوی الرضویة، ج:۷، ص:۵۸۳ الرسالة:الاحمدیة فیالوالایة الشرعیة والعرفیة.

سکتا ہے۔

فتاوی امام ظہیر الدین مرغینانی و غمز العیون میں ہے:

العلة فى عدم العمل بالخط كونه مما يزور ويفتعل أى من شانه ذلك وكونه من شانه ذلك يقتضى عدم العمل به وعدم الاعتماد عليه وإن لم يكن فى نفس الأمر كما هو ظاهر. اهـ.[1]

خط پر عمل نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ جعلی اور من گھڑت ہو سکتا ہے اور وہ جب ایسا ہو سکتا ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر عمل اور اعتماد نہ کیا جائے اگر چہ وہ نفس الامر میں ایسا نہ ہو جیسا کہ وہ ظاہر ہے۔

مذکورہ بالا جزئیات کی روشنی میں اعلیٰ حضرت کی اعلیٰ فقہی بصیرت، حیرت انگیز ضبط و استحضار غیر معمولی حافظہ، اور ژرف نگاہی عیاں ہے۔

﴿۹﴾

امام قاضی خاں کا قول زیادہ اعتبار و اعتماد کے لائق ہے، کثیر کتب فقہ سے اس کی وضاحت

امام اہل سنت فرماتے ہیں کہ علما کی تصریح ہے کہ امام قاضی خان کا ارشاد زیادہ اعتبار و اعتماد کے لائق اور ان کی تصحیح و ترجیح فائق ہے کہ انھیں رتبۂ اجتہاد حاصل تھا۔

اس پر علمائے کرام کے مختلف اقوال سے استناد فرماتے ہیں:

(۱) حاشیہ جامع الفصولین للعلامہ خیر الدین الرملی استاذ صاحب در مختار میں ہے: عليك بما فى الخانية فإن قاضى خان من أهل التصحيح والترجيح.

(۲) تصحیح القدوری للعلامہ قاسم میں ہے:

مايصححه قاضى خان من الأقوال يكون مقدماعلى ما يصححه غيره

(۱) الفتاوى الرضوية، ج:۷، ص:۵۸۳.

لأنه كان فقيه النفس.

ترجمہ: جن اقوال کی تصحیح علامہ قاضی خان کردیں وہ دوسروں کے تصحیح کردہ اقوال پر مقدم ہوں گے اس لیے کہ امام قاضی خان فقیہ النفس ہیں۔

(۳) حاشیہ سید احمد طحطاوی علی الدر المختار مطبوعہ مصر ج:۲/۲۵ میں ہے:

الذی يظهر اعتماد ما فی الخانية قولهم إن قاضی خان من أجل من يعتمد على تصحيحاته۔

جو خانیہ میں ہے اس پر اعتماد اس سے ظاہر ہے کہ فقہا فرماتے ہیں: قاضی خان ان جلیل القدر لوگوں میں سے ہیں جن کی تصحیح پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

(۴) غمزالعیون والبصائر شرح الاشباه والنظائر مطبوعہ مطبع مصطفائی دہلی ص:۲۷۵ میں ہے: هذا القول صححه قاضی خان فينبغی اعتماده. اس کو قاضی خان نے تصحیح قرار دیا ہے اس لیے اس پر اعتماد ہونا چاہیے۔

عقود الدرية مطبوعہ مصر جلد دوم ص:۵۷ر میں ہے. مايصححه قاضی خان مقدم على ما يصححه غيره. جس کی تصحیح قاضی خان فرمادیں وہ اس پر مقدم ہے جس کی تصحیح کوئی دوسرا کرے۔[1]

مذکورہ بالا عبارات سے اعلیٰ حضرت کی وسعت نظر اور اصول وآداب افتا پر آگہی کا پتا چلتا ہے کہ امام قاضی خان جس قول کی تصحیح فرمادیں یا جسے ترجیح دے دیں وہ قول دوسرے لوگوں کی تصحیح و ترجیح کے مقابلے میں معتبر قرار پائے گا، اس کی تائید میں اعلیٰ حضرت نے برجستہ پانچ کتابوں سے جزئیات نقل فرمائے۔

ضمناً رسم المفتی میں مہارت کی دوسری نظیر ملاحظہ کریں: علم الافتا کا ایک اہم باب یہ ہے کہ مفتی کو اس بات کا پورا پورا علم ہونا چاہیے کہ کتب فتاوی، شروح اور متون میں سے کون سی کتابیں معتبر اور کون سی غیر معتبر ہیں اسی طرح کون سی کتاب کب

(۱) الفتاوی الرضوية، ج:۷، باب التصرف فی المبيع والثمن ص:٦٧ ،رضااکیڈمی، ممبئی.

لائق استفادہ ہوگی اور کب نہیں ہوگی، اعلیٰ حضرت نے جابجا اپنی تصانیف میں اجمال و تفصیل کے ساتھ اس طرف اشارہ فرمایا ہے فتاوی رضویہ جلد ہفتم سے ایک اقتباس ذیل میں ملاحظہ کریں:

"ذخیرہ" ایک عمدہ مشہور مستند کتاب فتاوی ہے، "بدائع" امام ابو بکر بن مسعود کاشانی کی تصنیف اس کے بارے میں علما فرماتے ہیں: هذاالكتاب جليل الشان لم أرله نظيرا فى كتبنا.اھ. یہ کتاب عظیم الشان ہے۔ اور اس کی نظیر ہماری کتابوں میں نظر نہیں آتی۔ محیط کے بارے میں رقم طراز ہیں: محیط وہ کتاب ہے جس کا اعتبار آفتاب نیم روز ہے۔

فکر انگیز تحقیقات

امام احمد رضا قدس سرہ العزیز عبقری الشرق والغرب اور نابغۂ روزگار فقیہ تھے، وہ کسی مسئلے پر طائرانہ نگاہ ڈالنے کے بجاے بحث و تحقیق کی انتہا کو پہنچ جاتے تھے، ان کی تحقیق میں دریا کی روانی اور سمندر کی وسعت کا نقشہ نظر آتا ہے، ذیل کی سطور میں ان کی فکر انگیز تحقیقات کے چند شواہد ملاحظہ فرمائیں۔

﴿۱﴾

ولایت مجبرہ کی تمام قسموں کی مکمل توضیح و تحقیق

"ولایت مُجبِرَہ" جس کی تعریف تنفيذ القول على الغير شاء أو أبى ہے، اس کی دو قسمیں ہیں ایک **عرفیہ دنیویہ**: یہ ولایت بادشاہ کو رعایا اور حاکم کو محکومین پر ہوا کرتی ہے، اسی ولایت کی بنیاد پر سلاطین کو والیان ملک کہا جاتا ہے، دوسری **ولایت شرعیہ دینیہ**: یہ حقیقۃً اللہ عزوجل کو حاصل ہے پھر اس کی عطا سے اس کے حبیب **محمد مصطفیٰ** ﷺ کو حاصل ہے دوسری ولایت کو جو اللہ عزوجل کو حاصل ہے **حقیقیہ ذاتیہ** کہا جاتا ہے اور جو اس کی عطا سے اس کے محبوب ﷺ کو ہے اسے

عطائیہ کہا جاتا ہے، حقیقیہ ذاتیہ کا بیان اللہ عزوجل نے اس آیت کریمہ میں کیا "مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ "[۱] (ان کے لیے اللہ کے سوا کوئی ولی نہیں) اور ولایت عطائیہ کا بیان اس آیت میں ہے:

"اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ"[۲] (یہ نبی مسلمانوں کا ان کی جان سے زیادہ مالک ہے) اگر ان دونوں آیتوں کا اجمال دیکھنا ہو تو اس آیت میں دیکھیں:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا[۳]

اور نہ کسی مسلمان مرد نہ مسلمان عورت کو پہنچتا ہے کہ جب اللہ و رسول کچھ حکم فرمادیں تو انھیں اپنے معاملہ کا کچھ اختیار رہے اور جو حکم نہ مانے اللہ اور اس کے رسول کا وہ بے شک صریح گمراہی میں بہکا۔

پھر رسول اللہ ﷺ کی انابت سے اسے ہے جسے انھوں نے اپنی ولایت اصلیہ سے اختیار ظلی عطا فرمایا جتنی باتوں میں چاہا، ماذون مطلق کو مطلق اور ماذون امر خاص کو اس امر خاص میں، اس اختیار ظلی کا بیان اس آیت میں ہے: "اَلَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ"[۴] وہ جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔ اور ان تینوں قسموں حقیقیہ حقیقیہ ذاتیہ، عطائیہ اور ظلیہ کا اجتماع اس آیت میں ہے:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ.[۵]

---

(۱) الکهف:۲٦،پ:۱٥.
(۲) الأحزاب:٦،پ:۲۲.
(۳) الأحزاب:۳٦،پ:۲۲.
(۴) البقرة:۲۳۷،پ:۲
(۵) النساء:٥۹،پ:٥

اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور ان کا جو تم میں حکومت والے ہیں۔

ان آیات سے استدلال کے بعد اب اطیعوا کے دوبار میں لائے جانے کا راز بیان فرماتے ہیں:

اقول: یہی سر ہے کہ نوع دوم پر اطیعوا مکرر آیا کہ ذاتیہ وعطائیہ دو حقیقتیں ہیں اور نوع سوم کو اس اطیعوا دوم کے تحت مندرج فرمایا کہ ظل اصل سے جدا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔[1]

کافر مسلمان کا ولی اور قاضی نہیں ہو سکتا

امام اہل سنت اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس مسئلے کو پہلے قرآن مجید کی آیات سے منقح فرمایا پھر عبارات فقہا سے روشن کیا۔ آپ فرماتے ہیں:

> مگر مسلمان پر ولایت قسم دوم دینیہ شرعیہ جس سے مسلمان کے حق میں حکم غیر موجود شرعی مذہباً موجود ہو جائے اور دینی حیثیت سے آخرت میں اس کے کام آئے صرف مسلمانوں کے ساتھ خاص فرمائی ہے، اور کلمۂ حصر و تصریح نفی دونوں طور پر اسے صاف فرمادیا ہے کہ کسی کو مجال تاویل وابداے احتمال نہ رہے۔ اول اس آیت کریمہ میں "اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا " بے شک تمھارے ولی اللہ اور اس کے رسول اور اور ایمان والے ہیں (دوم) اس آیت کریمہ میں " وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا " (النساء:۵) اور ہر گز اللہ مومنوں پر کافروں کو راہ نہ دے گا۔ یہاں قطعاً وہی سبیل دینی شرعی مراد ہے، قرآن عظیم اس معنی کی آیات سے مشحون ہے۔ اب عبارات فقہا ملاحظہ کریں:

---

(۱) فتاوی رضویہ ۷/ ۴۹۳ مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی

حلبی علی الدر پھر شامی میں ہے: الکافر لایلی علی ولده المسلم لقوله تعالیٰ ولن یجعل الله للکفرین علی المؤمنین سبیلا. *نہایہ پھر عالم گیری پھر طحطاوی پھر ابن عابدین* میں ہے: "تقلید الذمی لیحکم بین أهل الذمة صحیح لا بین المسلمین وکذلك التحکیم".

تنویر الابصار میں ہے: لوحکّما عبداً فعتق أو صبیا فبلغ أو ذمیا فأسلم ثم حکم لاینفذ. *درمختار کتاب الشہادات* میں ہے: شرطها الولایةفیشترط الإسلام لوالمدعی علیه مسلما اور *کتاب القضایا* میں ہے: أهله أهل الشهادة وشرط أهلیتها شرط أهلیته فإن کلامنهما من باب الولایة.

ہدایہ میں ہے: لا ولایةلکافر علی مسلم لقوله تعالی ولن یجعل الله للکفرین علی المؤمنین سبیلا. *کافر کو مسلم پر کوئی ولایت نہیں اللہ تعالیٰ کے اس قول کی وجہ سے (اور ہر گز اللہ مومنوں پر کافروں کو راہ نہیں دے گا)۔ اس کی شہادات* میں ہے:لاتقبل شهادة الذمي علی المسلم لأنه لاولایة له بالإضافة إلیه ، *ذمی کی گواہی مسلم کے خلاف مقبول نہیں اس لیے کہ ذمی کو کوئی ولایت نہیں مسلم کی طرف نسبت کرتے ہوئے۔ مختصر امام قدوری میں ہے:*

لاتصح ولایة القاضی حتی یجتمع فی المولّٰی شرائط الشهادة.[1] *قاضی کی ولایت صحیح نہیں یہاں تک کہ والی والی میں شرائط شہادت جمع ہو جائیں۔(راقم)*

---

(۱) فتاوی رضویة، ۷/ ٤٩٥.

ہدایہ میں ہے: لأن حكم القضاء يستقى من حكم الشهادة لأن كل واحد منهما من باب الولاية فكل من كان أهلا للشهادة يكون أهلاللقضاءوما يشترط لأهلية الشهادة يشترط لأهلية القضاء.

اس لیے کہ قاضی کا فیصلہ شہادت کے حکم سے مستفاد ہوتا ہے اس لیے کہ قضاو شہادت میں سے ہر ایک ولایت کے باب سے ہے تو جو شہادت کا اہل ہوگا وہی قضا کا بھی اہل ہوگا پس جو شہادت کی اہلیت میں شرط ہے وہ قضا کی اہلیت میں بھی شرط ہوگی (ت)

فتاوی امام قاضی خان میں ہے:

لاولاية للصبي والمجنون ولاالمملوك ولاالكافر على المسلم. نابالغ، مجنون، غلام اور کافر کو مسلمان پر کوئی ولایت نہیں۔(ت)

بدائع ملک العلما مسعود کاشانی میں ہے:

لاشهادة للكافر على المسلم أصلا. مسلم کے خلاف کافر کی شہادت یک سر مقبول نہیں (راقم)

ان جزئیات فقہیہ کے علاوہ چند اور جزئیات بدائع کے حوالے سے اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالی علیہ نے نقل کیے ہیں جنھیں طوالت کے خوف سے ترک کیا جارہا ہے، آخر میں رقم طراز ہیں:

یہ گیارہ کتابوں کی عبارات ہیں، مختصر امام قدوری، فتاوی امام قاضی خان، بدائع امام ملک العلما، ہدایہ امام برہان الدین، نہایہ امام سغناقی، تنویر الابصار، در مختار، حلبی، طحطاوی، شامی۔ فتاوی عالم گیری اور خود کثرت عبارات کی کیا حاجت کہ بلا مبالغہ صدہا ہیں بلکہ شریعت نے اُن مسلمانوں پر سلطان اسلام کو بھی ولایت نہ دی جو

دارالحرب میں اسلام لائے اور ہنوز ہجرت کر کے ہمارے دار میں نہ آئے۔قال اللہ تعالیٰ عزوجل:

"وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا" اور جو ایمان لائے اور ہجرت نہ کی تمھیں ان پر کوئی ولایت نہیں جب تک ہجرت نہ کریں۔

مذکورہ بالا تحقیقات سے امام اہل سنت نے یہ ثابت فرمادیا کہ غیر مسلم خواہ بادشاہ وقت ہو یا کوئی والی و قاضی، مسلمانوں پر اسے کوئی ولایت شرعی حاصل نہیں، شہادت جو سب سے ادنی ولایت ہے یہ حاصل نہیں تو قضا جو اعلیٰ ولایت ہے وہ کیوں کر حاصل ہو سکتی ہے، اس امر کو فقہ کی گیارہ کتابوں کے جزئیات واضحہ صریحہ سے مزین و مبرہن فرمایا، متون، شروح اور فتاوی تینوں قسم کی کتابوں سے جزئیات پیش فرمائے۔

اور اگر بنظر غائر مطالعہ کیجیے تو اس مقام پر اعلیٰ حضرت کا رنگ اجتہاد بھی جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے، کہ خود نص قطعی قرآن مجید سے اولاً آپ نے اس حکم کا استنباط فرمایا، دیگر فقہا نے بھی قرآن عظیم کی اس آیت "وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا " سے اس امر کا حکم مستنبط فرمایا ہے لیکن ایک دوسری آیت اور بھی ہے جس سے اعلیٰ حضرت نے اس حکم کو نکالا وہ یہ ہے "اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا" یہ آیت کریمہ اس باب میں نہایت صریح ہے، ساتھ ہی اس امر کی صراحت بھی ہے کہ مسلمانوں پر کن کو ولایت حاصل ہے۔

اس مسئلے کو ایک دوسرے زاویے سے بھی سمجھایا ہے۔

فقہ کی کتابوں میں بہت سے مسائل اس اصل پر مبنی ہیں کہ اختلاف دار کی حالت میں سلطان اسلام کو ولایت نہیں، ہدایہ میں ہے:"اختلاف الدارين يقطع الولاية ولهذا يمنع التوارث" دارالاسلام اور دارالحرب کا اختلاف ولایت کو ختم کر دیتا ہے اسی وجہ سے ایک دوسرے کا وارث ہونے سے مانع ہے۔

اس جزئیہ کو نقل فرمانے کے بعد اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے مسئلہ دائرہ کے حکم

کا استخراج بہت ہی عمدہ طور پر فرمایا ہے آپ فرماتے ہیں:

تو بحالت اختلاف دین غیر مسلم کو مسلم کے دینی احکام میں مداخلت کیوں کر حکم شرعی ہو سکتی ہے بلکہ ولایت شرعیہ کا دائرہ اس سے بھی تنگ تر ہے خود سلطان اسلام کو، خود اس کے ملک میں، خود اس کی مسلمان رعایا پر صدہا باتوں میں ولایت شرعیہ نہ دی، اس کی نظیر وہی تزویج قاصرہ گذری کہ سلطان یا قاضی اسلام کا کیا ہوا نکاح نافذ نہیں اور باپ بھائی یا چچا یا کسی عصبہ بلکہ عصبہ نہ ہو تو ذوی الارحام اور وہ بھی نہ ہوں تو مولی الموالاۃ کا کیا ہوا نافذ۔

تنویر الابصار میں ہے:الولی فی النکاح العصبة بنفسه بشرط الإسلام فی حق مسلمة فإن لم تکن عصبة فالولاية للأم ثم للأخت ثم لولد الأم، ثم لذوی الأرحام(ثم مولی الموالاة .اهـ . در)ثم للسطان ثم القاضی نص علیه فی منشوره. ملخصا.[1]

ترجمہ: مسلمان لڑکی کے نکاح کی ولایت اس کے عصبہ بنفسہ کو حاصل ہوگی بشرطے کہ یہ مسلمان ہو، پس اگر عصبہ نہ ہو تو ولایت ماں کو پھر حقیقی بہن پھر ماں کی طرف سے اولاد کو پھر ذوی الارحام کو پھر مولی الموالاۃ کو پھر سلطان پھر قاضی۔ جس کی قضا کی سند میں نکاح صغار پر ولایت کی تصریح کر دی گئی ہو۔ کو ولایت حاصل ہوگی (راقم)

سطور بالا کا مفہوم یہ ہوا کہ اختلاف دار کے سبب وہ سلطان اسلام جو پورے ملک یا قلمرو کا فرماں روا اور والی ہے اس کو اس مسلمان پر ولایت نہیں جو دار الحرب میں مسلمان ہوا اور ابھی وہاں سے ہجرت نہ کی، جب اختلاف دار سے ولایت عرفیہ دنیویہ

(۱) فتاوی رضویة، ۷/ ٤٩٦.

حاصل نہیں ہوتی تو اختلاف دین و مذہب سے ولایت شرعیہ دینیہ جو عرفیہ سے اقوی ہے وہ تو بدرجۂ اولیٰ حاصل نہ ہوگی ماشاء اللہ! کتنا نفیس استدلال ہے، یہاں تک کہ سلطان اسلام اور قاضی کو بھی صدہا امور میں اپنی قلمرو اور حدود میں رہ کر بھی ولایت نہیں ہوتی، اس کو اعلیٰ حضرت نے متعدّد مثالوں سے سمجھایا ہے، یہاں صرف تنویر کی عبارت نقل کی گئی حالاں کہ امام اہل سنت نے اس نوع کی متعدّد نظیریں اشباہ والنظائر، در مختار، فتاوی امام رشید الدین، فتاوی وبری، فتاوی علامہ قاسم بن قطلوبغا اور قنیہ کے حوالے سے پیش فرمائی ہیں، ان امور سے جہاں اعلیٰ حضرت کی فکر انگیز تحقیقات، نادر قوت استدلال کا ثبوت فراہم ہوتا ہے وہیں آپ کی فقہی بصیرت، قوت اخذ و استنباط اور وسعت مطالعہ کے پہلو بھی عیاں ہوتے ہیں۔

اس امر کی تحقیق کہ اسلام میں قاضی بننے اور بنانے والے دونوں کا اسلام ضروری ہے

ما قبل میں اس امر کی تحقیق گزری کہ قضاے دینی شرعی کے لیے جو ولایت کی دوسری قسم شرعیہ دینیہ سے ہے، قاضی کا مسلمان ہونا شریعت اسلامیہ میں ضروری اور لازم ہے اب ذیل میں امام احمد رضا قدس سرہ اس امر کی تحقیق پیش فرما رہے ہیں کہ جس طرح قاضی کا مسلمان ہونا لازم ہے یوں ہی مقلِّد یعنی والیِ شہر حاکم ذی اختیار جو قاضی کو مقرر یا معزول کر سکتا ہے اس کا بھی مسلمان ہونا لازم ہے، دلیل یہ ہے کہ قضا ولایت مستقلہ نہیں بلکہ ولایت مقلِّد سے مستفاد ہے اور عدم مفید وجود نہیں ہو سکتا، اس کے علاوہ فقہ کی کثیر کتابوں کے جزئیات میں یہی صراحت ملتی ہے کہ قضا سپرد کرنے والے کا مسلمان ہونا ضروری ہے، ذیل کی سطور میں وہ جزئیات پیش کیے جا رہے ہیں جن سے صراحۃً یا اشارۃً اس کا ثبوت ملتا ہے۔

> فتح القدیر میں ہے: إذا لم يكن سلطان ولا من يجوز التقليد منه كما في بعض بلاد المسلمين غلب عليهم الكفار يجب عليهم أن يتفقوا على واحد

منهم يجعلونه واليا فيولى قاضيا ويكون هوالذى يقضى بينهم وكذا ينصبوا إماما يصلى بهم الجمعة.

ترجمہ: جب کوئی سلطان (اسلام) نہ ہو اور نہ کوئی حاکم ہو جس کی طرف سے قاضی کا تقرر ہو سکے جیسا کہ مسلمانوں کے بہت سے ممالک جہاں کفار مسلمانوں پر غالب آگئے ان پر واجب ہے کہ وہ اپنے میں سے کسی ایک پر اتفاق کر کے اس کو والی بنالیں پھر وہ کسی قاضی کا تقرر کرے اور یہ قاضی ان کے درمیان فیصلہ کرے اسی طرح ان پر واجب ہے کہ وہ اپنے لیے کسی کو امام مقرر کریں تاکہ وہ انھیں جمعہ کی نماز پڑھائے۔ (راقم)

جامع الفصولین میں ہے:

كل مصر فيه والٍ مسلم من جهة الكفار تجوز فيه إقامة الجمع والأعياد وأخذ الخراج وتقليد القضاء وتزويج الأيامى لاستيلاء المسلم عليهم وأمافي بلاد عليها ولاة كفار فيجوز للمسلمين إقامة الجمع والأعياد ويصير القاضى قاضيا بتراضى المسلمين ويجب عليهم طلب والٍ مسلم.اهـ .[1]

ہر ایسا شہر جہاں کفار کی طرف سے کوئی مسلم والی مقرر ہو وہاں جمعہ و عیدین قائم کرنا، خراج لینا، قاضی مقرر کرنا اور بے نکاحوں کا نکاح کرنا صحیح ہے کیوں کہ ان کا والی مسلم ہے، رہے وہ شہر جہاں کے والیان کافر ہیں وہاں مسلمانوں کے لیے عیدین اور جمعہ قائم کرنا جائز ہے اور قاضی مسلمانوں کی باہمی رضامندی سے قاضی ہو جائے گا اور مسلمانوں پر کسی مسلم والی کی جستجو واجب

---

(۱) فتاوی رضوية، ۷/ ۵۰۱.

ہے۔(راقم)

در مختار میں:

لو فقد وال لغلبة الكفار وجب على المسلمين تعيين والٍ وإمام للجمعة.فتح.

غلبۂ کفار کے سبب اگر مسلمان والی مفقود ہو تو اپنے طور پر مسلمانوں کے لیے کسی والی اور امام جمعہ کا تعین کرنا واجب ہے۔

اسی طرح بعینہ معراج الدرایہ و تاتارخانیہ و ردالمحتار وغیرہا میں ہے، ان کی عبارات بعونہ تعالیٰ عن قریب آتی ہیں۔

نہر فائق میں فتح القدیر کی عبارت نقل کر کے فرمایا:

هٰذا هوالذى تطمئن النفس إليه فليعتمد.

یہی وہ بات ہے جس پر نفس مطمئن ہے تو اسی پر اعتماد کیا جانا چاہیے۔

علامہ ابن عابدین نے اس پر فرمایا:

الإشارة بقوله هٰذا إلى ما أفاده كلام الفتح من عدم صحة تقلد القضاء من كافر .اھ.

نہر فائق کے قول "هٰذا" سے اس امر کی طرف اشارہ ہے جس کا افادہ کلام فتح نے کیا ہے یعنی کافر کی طرف سے قضا کا تقرر صحیح نہ ہونا۔(ر)

اور یہ خود نص محرر المذہب سیدنا امام محمد رحمۃ اللہ تعالی علیہ کی کتاب الاصل میں ہے کما سياتى إن شاء الله تعالىٰ.

یہ تمام نصوص صریحہ واضحہ قاطعہ ہیں کہ قضاے شرعی بمعنی مذکور کے لیے مُوَلّی و مُوَلّٰی دونوں کا اسلام ضروری ہے۔

یہاں تک قدرے تسہیل کے ساتھ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالی علیہ کی نقل کردہ عبارات پیش کی گئیں اب ہم ان کی مختصر توضیح پیش کرتے ہیں۔

فتح القدیر کی عبارت جو سب سے پہلے پیش کی گئی اس میں یہ کہا گیا کہ جب بادشاہ اسلام یا حاکم اسلام نہ ہو اور کافروں کا غلبہ ہو ایسی صورت میں مسلمان متفق ہو کر خود کسی کو اپنا والی منتخب کریں اور وہ والی، قاضی کا تقرر کرے۔ یہاں یہ حکم نہیں دیا گیا کہ غیر مسلم بادشاہ یا والی سے مسلمان اپنے لیے قاضی کا انتخاب کرائیں، بلکہ صاف کہہ دیا ولا من يجوز التقليد منه. اور وہ نہ ہو جس کی طرف سے قاضی کا تقرر صحیح ہے، اگر غیر مسلم کی طرف سے قاضی کا تقرر صحیح ہوتا تو ہر گز یہ جملہ نہیں لکھا جاتا بلکہ یہ کہا جاتا کہ جب سلطان اسلام نہ ہو تو سلطان غیر مسلم کی طرف سے قاضی کا تقرر صحیح ہے۔

اور جامع الفصولین کی عبارت میں تصریح کہ وہ شہر جہاں کے والیان کافر ہیں وہاں مسلمانوں کے لیے جمعہ و عیدین قائم کرنا جائز ہے اور قاضی کا تقرر مسلمانوں کی باہمی رضا مندی سے ہو گا، یہاں بھی کافر کی طرف سے قاضی مقرر کیے جانے کی بات نہیں، اسی طرح دیگر کتابوں کی عبارات کا مفاد وما حصل یہی ہے۔

مسکین و ہندیہ کی عبارات:

مسکین اور ہندیہ کی عبارتوں سے بعض لوگ مغالطے میں پڑ گئے مسکین کی عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمان خواہ عادل ہو یا ظالم حتی کہ کافر ہی کیوں نہ ہو اس کی طرف سے قاضی کی تقرری صحیح ہے، اور ہندیہ کی عبارت جسے تاتارخانیہ سے نقل کیا گیا ہے یہ ہے: "الإسلام ليس بشرط أي في السلطان الذي يقلد. اهـ" وہ باشاہ جو قاضی مقرر کرے اس کا مسلمان ہونا شرط نہیں ہے، انھیں دونوں عبارتوں کے پیش نظر مفتی عبد اللہ صاحب کو بھی مغالطہ ہوا اور لکھ پڑے:

"روایت نمبر ۱۰-۱۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ قضا کا عہدہ اور اس کے اختیارات دینے والے بادشاہ کا مسلمان ہونا ضروری نہیں"۔ (۱)

لیکن حقیقت اس کے بر عکس ہے امام اہل سنت نے فقہا کی ان عبارات کی

(۱) فتاوی رضویہ، ۷/ ۴۹۱، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی

گہرائی اور تہ میں اتر کر اصل ماخذ تک پہنچ کر ان جواہر آب دار کا انکشاف فرمایا ہے جہاں تک بڑے بڑے حضرات کی نگاہیں پہنچنے سے قاصر رہیں، علامہ حصکفی اور علامہ شامی جیسے محققین نے بھی ان عبارتوں سے اس حقیقت کی نقاب کشائی نہیں فرمائی جس کی یہ متقاضی تھیں، اور جس کے سبب بعد والوں کو غلط فہمی ہوئی لیجیے باغ تحقیق کے ان پھولوں سے آپ بھی اپنے مشام جاں کو معطر کریں اور فکر و نظر کو جلا بخشیں۔ امام اہل سنت کی توضیحات کا حاصل یہ ہے:

قاضی مقرر کرنے کے لیے بادشاہ ملک کا مسلمان ہونا ضروری نہیں اگر بادشاہ غیر مسلم کے تصرف و اختیار میں کوئی اسلامی ریاست ہو جس کے والی کی مسند نشینی غیر مسلم بادشاہ کی منظوری اور حکم سے ہوتی ہو پھر یہ مسلمان والی کسی مسلمان کو اپنی رعایا پر قاضی مقرر کر دے تو وہ قاضی شرع ہو جائے گا اگر چہ بالواسطہ اس کی قضا بادشاہ غیر مسلم کی طرف مستند ہوئی یعنی مسلمان والی ریاست کو غیر مسلم بادشاہ نے مقرر کیا تھا اور والی نے قاضی کو مقرر کیا تو کہا جائے گا کہ قاضی کو بھی بادشاہ نے ہی مقرر کیا اس لیے کہ مقلَّد کا مقلَّد مقلَّد ہوتا ہے بلکہ وہ مسلمان والی شہر خود اعلیٰ درجہ کا قاضی ہے حجر الدر میں ہے: ثم الوالی بالطریق الأولی شامی میں ہے: أي ثبوت الولاية للوالی أولی لأن القضاء يستمدها منه.اھ۔ یعنی والی کے لیے ولایت کا ثبوت بطریق اولیٰ ہو گا کیوں کہ قاضی تو اسی سے قضا پاتا ہے۔ (ر)

مذکورہ تحریر سے یہ ظاہر ہے کہ مسلمان والی کا تقرر بادشاہ غیر مسلم کے حکم اور اس کی منظوری سے بلا واسطہ ہو تو استفادۂ سبب اور قضا پر نظر رکھتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ قاضی کا تقرر سلطان غیر مسلم کی جانب سے ہوا، اگر چہ معاملے کی حقیقت یہ ہے کہ والی ملک کی ولایت اپنی ولایت عرفیہ یعنی غلبہ و استیلا سے مستفاد ہے کہ شرع مطہر نے مسلم والی کے لیے بھی صرف ولایت عرفیہ کو ولایت معتبرہ کے حصول کا سبب مانا ہے۔

فتاوی قاضی خان پھر بحر الرائق پھر رد المحتار میں ہے:

السلطان يصير سلطانا بأمرين بالمبايعة معه من الأشراف، والأعيان وبأن ينفذ حكمه على رعيته خوفا من قهره فإن بويع ولم ينفذ فيهم حكمه لعجزه عن قهرهم لا يصير سلطانا فإذا صار سلطانا بالمبايعة فجار إن كان له قهر و غلبة لاينعزل.

سلطان دو امروں کے سبب سلطان بنتا ہے ایک اشراف و اعیان حکومت کی بیعت دوسرے رعایا پر اس کا حکم نافذ ہونے کی وجہ سے اس کے غلبہ کے خوف سے لہٰذا اگر بیعت کی گئی لیکن دبدبہ وغلبہ قائم نہ ہونے کے سبب اس کا حکم رعایا میں نافذ نہ ہوسکا تو سلطان نہیں ہوگا اور جب بیعت کے سبب سلطان ہوگیا اور اس نے ظلم کیا اگر اس کا جبر اور غلبہ برقرار رہے تو معزول نہ ہوگا۔ (ر)

فصول عمادیہ پھر ہندیہ میں ہے۔

ذكر فى الفتاوى أيضا تجوز صلاة الجمعة خلف المتغلب الذى لامنشورله من الخليفة إذا كان سيرته فى رعيته سيرة الأمراء يحكم فيما بين رعيته بحكم الولاية لأن بهذا تثبت السلطنة فيتحقق الشرط.

فتاویٰ میں یہ بھی مذکور ہے کہ ایسے شخص کی اقتدا میں جمعہ کی نماز پڑھنا جائز ہے جو خود غلبہ پاکر خلیفہ کی منظوری کے بغیر اقتدار پر فائز ہوگیا، بشرطے کہ اپنی رعایا میں اُمرا کی سیرت وطریقہ پر چلے اور ولایت کی بنا پر رعایا میں حکم نافذ کرے کیوں کہ اس سے سلطنت کا ثبوت ہوجاتا ہے تو شرط بھی پائی جاتی ہے۔ (ر)

خلاصہ پھر بحرالرائق پھر طحطاوی پھر ابن عابدین میں ہے:

المتغلب الذى لاعهدله أى لامنشورله إن كان سيرته فيما بين الرعية سيرة الأمراء ويحكم بينهم بحكم الولاة تجوز الجمعة بحضرته.اهـ.[1]

---

(۱) فتاوى رضويه، ۷/ ۵۰۲ الرسالة الهبه الاحمدية فى الولاية الشرعية والعوفية،

خلیفہ کی اجازت کے بغیر از خود غلبہ حاصل کرنے والے نے اگر رعایا میں اُمرا کی سی سیرت قائم کرلی اور حکم ولایت کے سبب ان میں فیصلہ کرتا ہے تو اس کی موجودگی میں جمعہ جائز ہے۔(ر)

مندرجہ بالا جزئیات اس امر کے مثبت و مؤید ہیں کہ نواب یا والی شہر و ملک کو جو ولایت حاصل ہے وہ غلبہ اور استیلا کے سبب ہے یعنی ولایت عرفیہ کی بنیاد پر اور اس کو شرع مطہر نے حصول ولایت کا معتبر سبب مانا ہے، جیسا کہ قاضی خان، بحر الرئق اور ردالمحتار کی عبارت سے عیاں ہے اسی طرح فصول عمادیہ اور ہندیہ میں نقل کردہ فتوی کے جزئیات نے بتایا کہ از خود غلبہ پاکر خلیفہ کی منظوری کے بغیر اگر کوئی والی بادشاہ بن بیٹھے اور حکمرانوں کا طریقہ اختیار کرلے، انھیں کے طریقے پر رعایا میں فیصلہ کرے تو بھی حکومت و مملکت کا قیام عمل میں آجائے گا اور اس کے پیچھے نماز جمعہ صحیح ہوگی۔

اسی طرح غیر مسلم بادشاہ نے جس کو والی مقرر کیا ہے وہ در حقیقت اپنے غلبہ و استیلا کی بنیاد پر والی و حکمراں ہوا ہے اگر اس کا دبدبہ اور غلبہ ریاست میں نہیں ہوتا تو ہرگز بادشاہ اسے والی نہ بنا تا رہی بادشاہ کی منظوری اور اجازت تو یہ اس کی معاون ہے۔

اب ہم بعینہ امام اہل سنت کی وہ عبارت پیش کرتے ہیں جو انھوں نے ان تقریرات کے بعد خلاصۂ بحث کے طور پر رقم فرمائی ہے:

> غایت یہ کہ اس کی ولایت عرفیہ طریقۂ شرعیہ سے مستفاد، یعنی بحکم امیر المؤمنین نہیں، تو یہ ایک نواب کیا آج صدہا سال سے تمام روے زمین کے سلاطین اسلام ایسے ہی ہیں اپنے استیلا کے باعث ہی سلطان اسلام ہیں وہ اسے بھی حاصل، اور منظوری بادشاہ اورا س کی معین ہے نہ کہ مخل، رہا بوجہ منظوری سبب اس کی قضا کو تقلید بادشاہ غیر مسلم کی طرف منسوب کر سکتے ہیں، یہی دونوں صورتیں عبارت مسکین: يجوز تقليد القضاء من السلطان

العادل والجائر سواء كان كافرا أومسلما كذافى الأصل ، اور عبارت ہندیہ:ذكرفى الملتقط والإسلام ليس بشرط فيه أى فى السلطان الذى يُقلد كذا فى التاتارخانية. میں مراد ہیں اوراس پر دلیل قاطع یہ کہ مسکین نے اسے اصل سے نقل کیا اصل مبسوط امام محمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام ہے مبسوط کی عبارت یہ ہے جو ردالمحتار کتاب الصلاۃ میں بحوالہ معراج الدرایہ منقول۔

البلادالتى فى أيدى الكفار بلاد الإسلام لا بلاد الحرب لأنهم لم يظهروا فيها حكم الكفر بل القضاة والولاة مسلمون يطيعونهم عن ضرورة أو بدونها وكل مصر فيه وال من جهتهم يجوز له إقامة الجمعة والأعياد والحد و تقليد القضاء لاستيلاء المسلم عليهم فلو الولاة كفاراً يجوز للمسلمين إقامة الجمعة ويصير القاضى قاضيا بتراضى المسلمين ويجب عليهم أن يلتمسوا واليا مسلما.[1]

وہ ممالک جو کافروں کے زیر اقتدار ہیں بلاد اسلام ہیں بلادِ حرب نہیں اس لیے کہ کافروں نے اس میں کفر کے احکام ظاہر نہ کیے، بلکہ قاضیان و والیان مسلم ہیں وہ ان کی اطاعت ضرورت کے تحت کرتے ہیں یا بغیر ضرورت کے اور ہر وہ شہر جس میں کوئی حکمران ان کی طرف سے مقرر ہو اس کے لیے جمعہ، عیدین خود قائم کرنا اور قاضی مقرر کرنا جائز ہے، مسلمانوں کے کافروں پر غلبہ کے سبب ،اور اگر والیان کافر ہوں تو مسلمانوں کے لیے جمعہ قائم کرنا جائز ہے اور قاضی مسلمانوں کی باہمی رضامندی سے قاضی ہو جائے گا، اور مسلمانوں پر کسی مسلمان والی کو ڈھونڈنا واجب ہے۔(ر)

اور ہندیہ نے اسے تاتارخانیہ سے نقل کیا، تاتارخانیہ کی پوری عبارت یہ ہے

---

(۱) فتاوی رضویه، ۷/ ۵۰۲ ، رسالة: الهبة الأحمدية، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی

جو ردالمحتار کتاب القضا میں منقول ہے:

الإسلام ليس بشرط فيه أى فى السلطان الذى يقلد وبلاد الإسلام التى فى أيدى الكفرة لاشك أنها بلاد الإسلام لا بلاد الحرب لأنهم لم يظهروا فيها حكم الكفر والقضاة مسلمون والملوك الذى يطيعونهم عن ضرورة مسلمون ولوكانت عن غير ضرورة منهم ففساق وكل مصر فيه وال من جهتهم تجوز فيه إقامةالجمعةوالأعياد واخذ الخراج وتقليد القضاة وتزويج الأيامى لاستيلاء المسلم عليهم وأما بلاد عليها ولاة كفار فيجوز للمسلمين إقامة الجمع والأعياد ويصير القاضى قاضيا بتراضى المسلمين، فيجب عليهم أن يلتمسوا واليا مسلما منهم.اھ .[1]

مذکورہ بالا عبارات کا ترجمہ و مفہوم وہی ہے جو ماقبل کی عبارت کا ہے صرف الفاظ کی کچھ کمی بیشی ہے، ان عبارات فقہا سے جو مطالب و مفاہیم مستنبط ہوتے ہیں اب ہم انھیں آئندہ سطور میں قلم بند کرتے ہیں اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے ان عبارات سے جو نتائج اخذ کیے ہم ان کا حاصل اپنے لفظوں میں پیش کرتے ہیں:

مسکین و ہندیہ، تاتارخانیہ، معراج الدرایہ اور ردالمحتار وغیرہ کتابوں کی عبارات و جزئیات نے صاف صاف ایسے شہروں کی تین قسمیں فرمائیں جہاں جمعہ، عیدین، حد قائم کرنا اور قاضی مقرر کرنا جائز ہے۔

ایک وہ ملک جس میں مسلمان بادشاہ ہو مگر غیر مسلم حکومت کے زیر اثر ہو جیسے : آج کل بخارا شریف (اور ہمارے زمانے میں اس کی واضح مثال افغانستان و عراق ہیں۔ راقم) اس کا بیان مبسوط میں "بل القضاة والولاة مسلمون يطيعونهم عن ضرورة أوبدونها " اور تاتارخانیہ میں ففساق تک ہے دوسرا وہ ملک جہاں بادشاہ غیر مسلم ہو لیکن ریاست اسلامی اور والی ریاست صاحب

(۱) فتاوى رضويه، ۷/ ۵۰۳ ، رسالة: الهبة الأحمدية فى الولاية الشرعية والعرفية، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی

فوج وخزانہ مسلمان ہواس کا بیان "كل مصرفيه وال من جهتهم" سے "لاستيلاء المسلم عليهم" تک ہے تیسری صورت یہ ہے کہ ریاست پر کوئی والی یعنی مسلمان نہ ہو عام ازیں کہ غیر مسلم سلطان نے تنہا اس پر قبضہ جمار کھا ہو یا کوئی غیر اسلامی ریاست بھی اس کی شریک ہو جیسے: رجواڑے۔ اس کا بیان بقیہ عبارتوں میں ہے، ان عبارتوں میں قاضی شرع مقرر کرنے کو دو پہلی صورتوں کے ساتھ خاص کیا گیا ہے، یعنی قاضی شرع کا تقرر ان دو صورتوں میں صحیح ہے کہ جب والی قاضی کا تقرر کرنے والا مسلمان ہو عام ازیں کہ ملک کا بادشاہ مسلم ہو یا غیر مسلم، رہی آخری صورت کہ نہ والی مسلم ہو نہ بادشاہ اس صورت میں سلطان غیر مسلم کی طرف سے قاضی کا تقرر صحیح نہیں۔

اور مسکین و ہندیہ کی عبارتوں میں جہاں یہ کہا گیا ہے: يجوز تقلد القضاءمن السلطان العادل والجائر سواء كان كافرا أو مسلما كذا فى الأصل. فى الملتقط والإسلام ليس بشرط فيه أى فى السلطان الذى يقلد.اهـ.

وہاں یہی دوسری صورت مراد ہے کہ بادشاہ غیر مسلم ہو اور والی ریاست صاحب فوج و خزانہ مسلم ہو، اور یہاں ظاہراً تقلید کی نسبت سلطان غیر مسلم کی طرف ادنی مناسبت کی وجہ سے کردی گئی کہ بادشاہ کے مقرر کردہ والی نے انھیں قاضی بنایا گویا بادشاہ نے ہی بنایا ورنہ حقیقۃً قاضی، والی مسلم کے مقرر کرنے سے ہی ہوا ہے کہ والی کو از خود غلبہ و استیلا حاصل ہے اور اس کا حکم اس کی رعایا پر نافذ، بادشاہ کی منظوری تو بس معین و مؤید کی حیثیت رکھتی ہے۔

تیسری قسم کی صورت وہی ہے جو بعینہ فتح القدیر و جامع الفصولین میں گزری کہ اب قضائے شرعی مسلمانوں کی باہمی رضا پر رہے گی، مبسوط کی جو عبارت ردالمحتار نے بحوالہ معراج الدرایہ نقل کیا اس میں صاف صراحت ہے۔

فلوالولاة كفارايجوز للمسلمين إقامة الجمعة ويصير القاضى

قاضیا بتراضی المسلمین ویجب علیهم أن یلتمسواوالیا مسلما.اهـ.

اب بھی اگر قاضیِ شرعی کی تقرری صحیح ہو یعنی والیان کے کافر ہونے کی صورت میں بھی تو اس تخصیص اور تفریق حکم کے کیا معنی تھے، کہ قاضی مسلمانوں کی تراضی سے قاضی ہو گا، اور محقق علی الاطلاق کی عبارت نے تو اس مفاد صریح کو اور بھی اوضح واصرح کر دیا کہ فرمایا: إذالم یکن من یجوز التقلید منه الخ.[۱]

تو عبارات فقہا سے روشن ہو گیا کہ غیر مسلم کی طرف سے قضاے شرعی انھیں دو صورتوں میں ہے کہ مُوَلّی مسلمان ہو کہ پہلی صورت میں بادشاہ مسلم اور دوسری صورت میں نواب مسلم ہے تیسری صورت میں یہ حکم ہرگز نہ رکھا اور صراحۃً اس کا جائز نہ ہونا ظاہر فرما دیا، تو مسکین و ہندیہ جو انھیں اصل اور تاتارخانیہ کا حوالہ دے رہے ہیں قطعًا ان کی یہی مراد لازم ورنہ حوالہ باطل اور نقل خلاف اصل ہو جائے گی۔[۲]

مسکین و ہندیہ کی عبارتوں سے مغالطے کی وجہ:

امام اہل سنت اس گتھی کو بھی سلجھانا چاہتے ہیں کہ مسکین و ہندیہ کی عبارتوں سے کیوں مغالطہ ہوا۔

> ہاں! ان دونوں کے اختصار شدید نے اشارتِ وہم کی جس کے سبب بحر الرائق نے قول مسکین نقل کر کے عبارات مذکورۂ فتح القدیر و جامع الفصولین سے اس کا رد فرمایا کہ "فی فتح القدیر مایخالفه (وأثرماأسلفنا ثم قال) ویؤیده مافی جامع الفصولین (ونقل ماقدمنا) یوں ہی در مختار نے قول مسکین ذکر کر کے کلام فتح سے اس کا تعقب کیا اور نہر الفائق نے کلام فتح

---

(۱) فتاوی رضویه، ۷/ ۵۰۳ ،رسالة: الهبة الأحمدية فى الولاية الشرعية والعرفية، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئ

(۲) فتاوی رضویه، ۷/ ۵۰۳ رسالة: الهبة الأحمدية فى الولاية الشرعية والعرفية، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئ

ن قل فرما کر اسی پر اعتماد لازم بتایا یہ سب کچھ کلام مسکین میں حوالۂ
کتاب الاصل دیکھنے پر ہوا جو محرر المذہب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کتب ظاہر
الراویہ سے ہے، اس درجہ قوت عظیمہ کے تخیل پر بھی ان اکابر
محققین نے اعتماد نہ فرمایا، مگر بحمد اللہ تعالیٰ عبارت اصل یوں ہی
ہندیہ کی منقول عنہا تاتارخانیہ کی اصل عبارت دیکھنے نے تمام
سحاب شبہات واوہام کا پردہ چاک کر کے حق کا چاند چمکا دیا۔
والحمد لله رب العلمين هكذاينبغى التحقيق والله تعالىٰ ولي التوفيق. (۱)

مذکورہ بالا عبارتوں میں امام احمد رضا قادری قدس سرہ القوی نے اس امر کو واشگاف کر دیا کہ صاحب بحر علامہ ابن نجیم حنفی، اور صاحب در مختار جیسے محققین نے مسکین کی عبارتوں کا رد کیوں فرمایا؟ اس پر تعقب کیوں کیا؟ اس کی وجہ یہی تھی کہ مسکین نے اصل کی پوری عبارت نقل نہیں کی بلکہ اس میں شدید اختصار کیا یہاں تک کہ مختصر ہوکر اتنی باقی رہی "يجوز تقلد القضاء من السلطان العادل والجائر سواء كان كافرا أومسلما كذافى الأصل.اهـ ." ظاہر بات ہے کہ مذکورہ عبارت سے کوئی بھی دھوکا کھا سکتا ہے اگر منقول عنہا کتب کو نہ دیکھے لہٰذا ردعمل یقینی ہے، پھر صاحب نہر الفائق کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نہر الفائق نے مسکین پر اعتماد ہی نہیں کیا بلکہ کلام فتح نقل فرما کر اس پر اعتماد کو لازم بتایا، امام اہل سنت کی یہ تحقیق اس قدر فکر انگیز اور حقائق کشا ہے کہ غور کرنے والا اس کی گہرائیوں میں گم ہو کر رہ جاتا ہے، اور اعتراف حقیقت کیے بغیر کوئی چارہ نہیں رہ جاتا، ان کی تحریر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اپنے سے پیش تر علما سے جو فروگذاشتیں ہوئیں ہیں ان کی توضیح و تشریح اور عبارتوں کے درمیان توفیق و تطبیق اس خوش اسلوبی کے ساتھ کرتے ہیں کہ ان کے دامن نظر پر کوئی دھبا نہیں لگنے دیتے نہ ان پر طعنہ کش

(۱) فتاوی رضویہ، ۷/ ۵۰۳-۵۰٤، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی

ہوتے ہیں نہ ان کا استہزا فرماتے ہیں، یہ آپ کا ایسا باکمال وصف ہے جس میں آپ کا شریک وسہیم نظر نہیں آتا۔

یہاں تک امام احمد رضا علیہ الرحمۃ والرضوان نے دو امروں کے بارے میں تحقیق انیق فرمائی تھی اول یہ کہ غیر مسلم کبھی بھی مسلمانوں کا قاضی نہیں ہو سکتا تاآں کہ وہ اسلام نہ لے آئے اور اس امر کو انھوں نے دلائل و براہین، نصوص قطعیہ، اور جزئیات فقہ کی روشنی میں اتنا واضح اور منقح فرمادیا کہ مخالف و موافق کسی کے لیے مجال انکار و تاویل نہ رہی، نیز آپ کا فقہی کمال یہ ہے کہ جن جزئیات کی روشنی میں مفتی موصوف نے غیر مسلم جج کو قاضی شرع بنانے کی بات کہی تھی انھیں جزئیات سے آپ نے عدم جوازِ قضا ثابت کر دیا۔

دوم یہ کہ جس طرح قاضی کے لیے اسلام شرط ہے اسی طرح مُوَلّی، قاضی مقرر کرنے والے کے لیے بھی اسلام لازم ہے کسی غیر مسلم کی طرف سے قاضی کا تقرر صحیح نہیں، اس کو کثیر کتب فقہ کے صریح جزئیات سے محقق کر دیا، علاوہ ازیں ایک مفتی نے اپنی پیش کردہ عبارتوں سے جو مفہوم اخذ کیا تھا، اور جن عبارتوں کو انھوں نے مستدل بہا قرار دیا تھا امام اہل سنت نے ان تمام استدلالات کو فاسد و باطل قرار دیا اور تیس (۳۰) وجہوں سے ان کے استدلالات پر کلام فرمایا اور یہ ثابت کر دیا کہ ان کی پیش کردہ تمام عبارتوں کا مسئلہ مذکورہ سے کوئی مس بھی نہیں ہے، اور یہ سراسر استدلال فاسد و اجتہاد عاطل ہے۔

﴿۲﴾

سود سے بچنے کے لیے حیلہ کرنا جائز ہے

سود سے بچنے کے لیے حیلہ کرنا جائز و درست ہے اور اس بارے میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا قول کافی اور شافی ہے کہ فرمایا: ”إن العينة جائزة ماجور من عمل بها قال وأجره لمكان الفرار من الحرام“ عینہ جائز ہے اور اس کا کرنے

والا ثواب پائے گا، اس میں ثواب اس وجہ سے ہے کہ حرام سے بھاگنا ہے۔ [1]

بیع عینہ در حقیقت سود سے بچنے کا ایک حیلہ ہے، اور دفع ربا کے لیے حیلہ کرنا مستحسن ہے اس کے ثبوت میں اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے احادیث و اقوال فقہا سے استناد فرمایا ہے، اب ہم ذیل میں اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی وہ تحقیق، تسہیل و تلخیص کے ساتھ پیش کر رہے ہیں، فرماتے ہیں:

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا: صحابۂ کرام نے بیع عینہ کیا اور اس کی تعریف فرمائی اور فتاوی قاضی خان میں ہے کہ اس کا مثل نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ حضور نے اس کا حکم دیا، تو اب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے حکم دینے کے بعد کون ہے جو اس کو ناجائز بتائے۔

بحر الرائق میں **قنیہ** سے ہے کہ وہ بیعیں جو لوگ ربا سے بچنے کے لیے کرتے ہیں ان میں کچھ حرج نہیں، پھر ایک اور عالم کے نام رمز لکھی کی انھوں نے مکروہ کہا ہے، امام بقالی نے ان کی کراہت امام محمد سے روایت کی، جب کہ امام اعظم و ابو یوسف کے نزدیک ان میں کوئی حرج نہیں، اسی طرح امام شیخ الاسلام خواہر زادہ نے اس کے جواز پر اتفاق نقل فرمایا ہے جب کہ قرض میں بیع کی شرط نہ لگائی ہو، تو جب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اس کی تعلیم ثابت، اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے اس کا کرنا، اور ہمارے اماموں کا اس کے جواز پر اجماع قائم تو اب شک کی کون سے جگہ باقی رہی،

اقول: پھر یہ بھی اس صورت میں ہے کہ بیع اور قرض جمع ہوں، اس طور پر کہ مُقرِض حاجت مند کو کچھ روپے قرض دے، اور تھوڑی سی چیز زیادہ قیمت پر اس کے ہاتھ بیچے تو قرض کی حاجت کی وجہ سے مستقرض اسے قبول کرلے گا، تو اس صورت میں قرض اگر پہلے دیا ہے تو بعض نے بیع کو مکروہ کہا ہے، اس لیے کہ یہ وہ قرض ہوا جس نے ایک منفعت کھینچی، اور اگر بیع پہلے ہو چکی تھی تو بالاتفاق اس میں کوئی حرج نہیں اس لیے کہ

---

(۱) رد المحتار، ٤/ ۱۹۳ (مصطفی البابی مصر).

یہ ایک بیع ہے جو قرض کا نفع لائی جیسا کہ امام شمس الائمہ حلوانی نے افادہ فرمایا اور اس پر فتوی دیا کما فی ردالمحتار.[1]

قرآن وحدیث سے اس قسم کے حیلوں کے جواز کی دلیلیں:

یہاں تک اعلیٰ حضرت نے فقہاے کرام کے اقوال کی روشنی میں اس طرح کے حیلوں کا جواز ثابت فرمایا، اب قرآن مجید اور حدیث نبوی علی صاحبہ الصلاۃ والتسلیم سے ایسے حیلوں کے جواز کا ثبوت فراہم کر رہے ہیں، دیدۂ دل سے وہ بصیرت افروز دلیلیں ملاحظہ فرمائیں:

وان شئت الزيادة فی أمرالحيل فهذا ربنا تبارك و تعالىٰ قائلا لعبده أيوب عليه الصلاة والسلام خذ بيدك ضغثا فاضرب به ولا تحنث.

اور اگر تو مسئلہ حیلہ میں زیادتی دلیل کا خواہش مند ہو تو یہ ہے ہمارا رب عزوجل تبارک وتعالیٰ اپنے بندے ایوب علیہ السلام سے فرماتا ہوا، (اپنے ہاتھ میں ایک جھاڑو لے لے اس سے مار اور قسم نہ توڑ) اور یہ ہیں ہمارے سردار رسول اللہ ﷺ کہ انھوں نے ربا سے بچنے کا حیلہ اور ایسا طریقہ تعلیم فرمایا کہ مقصود حاصل ہو جائے، اور حرام سے محافظت رہے:

روى الشيخان عن أبي سعيد الخدري رضى الله تعالىٰ عنه قال جاء بلال رضى الله تعالىٰ عنه إلى النبي ﷺ بتمر بَرنى فقال له ﷺ: من أين هذاقال: كان عندنا تمررديء فبعت منه صاعين بصاع فقال: أوّه عين الربا، عين الربا لاتفعل ولكن إذا أردت أن تشترى فبع التمر ببيع اٰخر ثم اشتربه.وأيضالهما عنه[2] وعن أبي هريرةرضى الله تعالىٰ عنهما أن رسول الله ﷺ استعمل رجلا على

(۱) الفتاوى الرضوية، ۷/ ۱۹۳-۱۹٤، الرساله: كفل الفقيه الفاهم.

(۲) الفتاوى الرضوية ۷/ ۱۹٤-۱۹۵.

خيبر فجاءه بتمر جنيب فقال: أكلُّ تمر خيبر هكذا قال: لا! والله يا رسول الله إنا لنأخذ الصاع من هذا بالصاعين و الصاعين بالثلاث فقال: لاتفعل بع الجمع بالدراهم ثم ابتع بالدراهم جنيبا.(۱)

بخاری و مسلم نے ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا کہ انھوں نے فرمایا: بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس خرمائے برنی لائے، نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ یہ تم نے کہاں سے لیے؟ انھوں نے عرض کی کہ ہمارے پاس خراب چھوہارے تھے ہم نے اس کے دو صاعوں کے بدلے ان کا ایک صاع خریدا تو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اف! خالص ربا ہے، خالص ربا، ایسا نہ کرو مگر جب ان کو خریدنا چاہو تو اپنے چھوہاروں کو کسی اور چیز سے بیچ کر اس شے کے بدلے ان کو خریدو۔

نیز بخاری و مسلم نے ابو سعید خدری اور ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما دونوں سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک شخص کو خیبر کا والی بنا کر بھیجا، وہ خدمت اقدس میں خرمائے جنیب لے کر حاضر ہوئے، حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: خیبر کے سب چھوہارے ایسے ہی ہیں؟ عرض کی نہیں خدا کی قسم یا رسول اللہ! ہم اس میں کا ایک صاع دو صاع کے اور دو صاع تین صاع کے عوض لیتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسا نہ کرو اپنے چھوہاروں کو روپیوں سے بیچ کر روپیوں سے یہ چھوہارے خرید لو۔

(۳)

تقوم میں شَے کی موجودہ حالت دیکھی جاتی ہے نہ یہ کہ اصل میں کیا تھی

۱۳۲۴ھ میں امام احمد رضا قدس سرہ نے جب رسالہ کفل الفقیہ الفاہم مکمل فرما لیا تو مکہ مکرمہ ہی کے اندر بعض علما کے ذریعہ یہ خبر ان تک پہنچی کہ یہاں کے ایک عالم فاضل حامد احمد محمد جدّاوی نے بطور مذاکرہ یہ فرمایا کہ علامہ ابن عابدین نے ردالمحتار میں اس مسئلہ کے تحت کہ بیع منعقد ہونے کی شرط مبیع کا مال متقوم

(۱) بخاری، ۱/ ۲۹۳.

ہونا ہے یہ تفریع ذکر کی:

فلم ینعقد بیع کسرة خبز لأن أدنی القیمة التی تشترط لجوازالبیع فلس.اھ.(۱)

ایک ٹکڑے روٹی کی بیع باطل ہے اس لیے کہ جواز بیع کے لیے کم سے کم ایک پیسہ قیمت ہونا شرط ہے۔

اور ظاہر ہے کہ کاغذ کا اتنا ٹکڑا ایک پیسہ کی قدر نہیں تو نوٹ کی بیع باطل ہونا چاہیے کہ اصلاً ہوئی ہی نہیں، حرام یا مکروہ ہونا تو درکنار۔

امام احمد رضا قدس سرہ نے فاضل ممدوح کے اس اعتراض پر بہت ہی نفیس، دل پذیر، فکر انگیز اور مُسکت جواب رقم فرمایا ہے، جس کا حاصل یہ ہے:

> فاضل موصوف نے یہ بات میرا رسالہ دیکھنے سے پہلی کہی ہے، کاش وہ میرا رسالہ دیکھ لیتے اور اس کے مضامین پر مطلع ہوتے۔ اور اعتراض کا جواب تو خود ان کے اس قول ہی سے ظاہر ہے کہ یہ کاغذ کا ٹکڑا ایک پیسہ کا نہیں اس لیے کہ لایساوی ولم یکن یساوی میں کھلا ہوا فرق ہے ان کا یہ کہنا کہ کاغذ کا اتنا ٹکڑا ایک پیسہ کا نہیں اس لیے کہ اب تو وہ سو روپے کا ہے اور شَے کی موجودہ حالت دیکھی جاتی ہے نہ یہ کہ اصل میں کیا تھی، عربی متن یہ ہے:
>
> والجواب ظاھر بملاحظة قوله لایساوی فلسا فبون بین بین لایساوی ولم یکن یساوی لأنه الاٰن یساوی مائة وألفا والنظر للحال لا للأصل.

اس کے بعد چند مثالوں کے ذریعے اس ضابطے کو خوب روشن اور مدلل فرمایا ہے لکھتے ہیں:

---

(۱) ردالمحتار علی الدرالمختار، ج:٤، ص:٦ ،مطلب شرائط انواع البیع.

ألا ترى أن بيع أواني الخزف والطين كبارها وصغارها من الحب والجفنة إلى نحورأس الشيشة شائع ذائع بين عامة المسلمين ولم ينكره أحد مع أن أصله تراب والتراب ليس بمال بل لو نظر للأصل لعادت مسئلة الفلس المتمسك بها على نفسها بالنقض لما علمت أن قطعة نحاس بوزن فلس لا تساوي فلسا قط بل لا تبلغ نصفه أيضا. فبالنظرللأصل لايساوي الفلس نفسه فلسا فلا يكون مالا متقوما فكيف يكون قيمةً وثمناً.اهـ [1]

کیا نہیں دیکھتے کہ پکی اور کچی مٹی کے برتن، چھوٹے اور بڑے گولی اور کونڈے (روٹی پکانے کا مٹی کا ایک ظرف) سے لے کر چلم (آگ اور تمباکو رکھنے کا ظرف جسے حقہ پر رکھ کر کش لگاتے ہیں) تک، ان کی بیع تمام مسلمانوں میں رائج و معروف ہے اور کوئی اس پر انکار نہیں کرتا، حالاں کہ ان کی اصل مٹی ہے اور مٹی مال نہیں، اور اصل کو دیکھیں تو وہ پیسہ کا مسئلہ خود اپنے ہی نفس کا ناقض ہوگا اس لیے کہ آپ کو معلوم ہے کہ تانبے کا پتّر جو وزن میں ایک پیسہ کے برابر ہو ہر گز ایک پیسہ بلکہ نصف پیسے کا بھی نہیں ہوتا، تو اصل پر نظر کرنے سے خود ایک پیسہ ایک پیسہ کا نہیں تو مال متقوم نہ ہوا تو قیمت اور ثمن کیوں کر ہو سکتا ہے۔

مسئلہ مذکورہ کی توضیح میں امام احمد رضا قدس سرہ نے قرآن مجید کے ایک نص سے بھی استدلال فرمایا ہے اور یہ ایسا استدلال ہے جو یقیناً رب علّام کے فیض سے قلب اعلیٰ حضرت پر القا ہوا ہے آپ فرماتے ہیں:

ألا ترى أن العالم معظم شرعا و عقلا و عرفا ولا نظر إلى أنه

---

(۱) العطايا النبوية فى الفتاوى الرضوية، ج:۷،ص:۱۳۸.

فی الأصل من الذین قال اللہ تعالیٰ فیھم "ھوالذی اخرجکم من بطون امھٰتکم لاتعلمون شیئا" وماذلك إلالأنه بحدوث وصف فيه صار متقوما عند اللہ و عندالناس بعد أن لم یکن کذلك.

کیا نہیں دیکھتے کہ شرع میں، عقل میں اور عرف میں عالم کی تعظیم ہے اور اس پر نظر نہیں کہ وہ اصل میں ان لوگوں سے ہے جن کی نسبت رب عزوجل نے فرمایا کہ:

اللہ وہ ہے جس نے تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹ سے اس حال پر پیدا کیا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے۔ [۱]

تو یہ اسی سبب سے ہے کہ اس میں ایک وصف پیدا ہو گیا جس کے سبب خالق اور مخلوق سب کے نزدیک اس کی عزت ہو گئی جو پہلے نہ تھی، ایسے ہی علم کا ورق اس وجہ سے قیمتی ہو گیا کہ اس میں وہ علم لکھ دیا گیا اور ایسے ہی نوٹ جس میں چھاپے کے سبب وہ بات پیدا ہو گئی جس نے نفع کے باعث رغبتوں کو اس کی طرف کھینچ دیا اور طبیعتیں اس کی طرف میل کرنے لگیں، اور اس میں دینا اور روکنا جاری ہوا۔ [۲]

تقوم میں شَے کی حالت موجودہ دیکھی جاتی ہے اس کے ثبوت میں اعلیٰ حضرت نے چند نظائر پیش فرمائے جن سے یہ واضح ہو گیا کہ کوئی شَے اپنی اصل کے اعتبار سے ایک پیسہ کی قیمت کو نہ پہنچے تو بھی اس کی بیع صحیح ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ پکی اور کچی مٹی کے برتن، چھوٹے چھوٹے گولی اور کونڈے سے لے کر چلم تک کی بیع دنیا بھر کے مسلمانوں میں رائج ہے اور کوئی اس پر انکار نہیں کرتا حالاں کہ اس کی اصل مٹی ہے اور مٹی مال نہیں، اسی طرح پیسہ کو لے لیں کہ اصل کے اعتبار سے تانبے کا ایک پتّر ہے جو وزن میں ایک پیسہ کے برابر ہے جب تک اسے ڈھالا نہ جائے اس کی قیمت آدھے پیسہ کو بھی نہیں پہنچتی، تو جب اصل پر نظر کرنے سے جو ایک پیسہ ہے وہ ایک پیسہ کا نہیں ہے تو مال متقوم بھی نہ ہوا اور جب قیمت والا مال نہ ہوا تو اسے قیمت اور ثمن قرار

---

(۱) القرآن: النحل آیت۷۸.

(۲) الفتاوی الرضویة، ج:۷،ص:۱۳۸.

دینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟

﴿۴﴾

بیع عِینَہ کی تحقیق اور اس کا حکم

بیع عِینَہ:

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ نے امام فقیہ النفس قاضی خاں رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے حوالے سے بیع عینہ کا یہ مفہوم نقل فرمایا ہے:

قرض لینے والے کے پاس کوئی متاع نہیں دینے والے کے پاس ہے۔ اور دینے والا چاہتا ہے کہ دس روپے قرض دے اور کسی میعاد پر تیرہ روپے اس سے وصول کرے تو متاع اس کے قبضے میں دے دے، پھر قرض لینے والا اس متاع کو کسی اجنبی کے ہاتھ دس روپے کو بیچے اور وہ متاع اس اجنبی کو دے دے، وہ اجنبی قرض دینے والے کے ہاتھ دس روپے کو بیچ ڈالے، اور وہ اجنبی اس سے دس روپے لے کر قرض لینے والے کو دے دے، تو اجنبی پر جو قرض لینے والے کا دین تھا وہ اتر جائے گا اور وہ متاع قرض دینے والے کے پاس دس میں پہنچ جائے گی اور قرض لینے والے پر اس کے تیرہ روپے ایک وعدہ پر لازم ہو جائیں گے۔ انتہی۔(۱) امام قاضی خان نے فرمایا: اسی کا نام بیع عینہ ہے۔

بیع عینہ کے بارے میں حضرت امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کوئی نص صریح منقول نہیں کہ یہ جائز ہے یا ناجائز یا مکروہ، محرِّر مذہب حنفی حضرت امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک یہ بیع مکروہ ہے۔

آپ فرماتے ہیں:”هذا البيع في قلبي كأمثال الجبال ذميم

---

(۱) الفتاوى الرضوية ج:۷ ص:۱۷۱ .

اخترعه أكلة الربا“ اس بیع کی برائی میرے دل میں پہاڑوں کے برابر ہے اسے سود خوروں نے ایجاد کیا ہے۔

اس کے مکروہ ہونے پر آپ کی دلیل وہ حدیث ہے جسے امام احمد، ابوداؤد، بزار، ابو یعلی اور بیہقی نے حضرت نافع سے انھوں نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا:

قال عليه الصلاة والسلام: إذا تبايعتم العينة واتبعتم أذناب البقر ذللتم وظهر عليكم عدوّكم.

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم بطور عینہ خرید و فروخت کرو اور بیلوں کی دم کے پیچھے چلو تو ذلیل ہو جاؤ گے اور تمھارا دشمن تم پر غالب آجائے گا۔(۱)

اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک جائز ہے اس میں کوئی کراہت نہیں بلکہ ایسی بیع کرنے والے کو ثواب ملے گا کہ اس میں سود سے چھٹکارا حاصل کرنے کا بہترین حیلہ ہے، یہی مذہب کثیر صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا ہے اور اسی کو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قدس سرہ نے اختیار فرمایا، اعلیٰ حضرت رقم طراز ہیں:

ردالمحتار میں طحطاوی اس میں عالم گیری اس میں مختار الفتاوی، اس میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منقول ہے کہ عینہ جائز ہے اور اس کے کرنے والے کو ثواب ملے گا۔ اھ

فتح القدیر میں فرمایا عینہ میں کوئی کراہت نہیں سوائے خلاف اولی کے اس لیے کہ اس میں قرض دینے کے اچھے سلوک سے روگردانی ہے، اھ اور اسے بحر الرائق اور نہر الفائق اور در مختار اور شرنبلالیہ وغیرہ نے برقرار رکھا، نیز فتح القدیر میں ہے امام ابو یوسف نے فرمایا: لایکرہ ھذاالبیع یہ بیع مکروہ نہیں، اس لیے کہ بہت سے صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اسے کیا اور اس کی تعریف کی اور اسے سود نہ ٹھہرایا۔(۲)

---

(۱) الفتاوى الرضوية ،ج:۷ ص:۱۷۱ .
(۲) الفتاوى الرضوية، ج:۷ ص:۱۷۳-۱۷٤ .

مذکورہ بالا فقہی کتابوں سے اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہ واضح فرمادیا کہ امام ابو یوسف کے نزدیک یہ بیع جائز و درست ہے اس میں کوئی کراہت نہیں نیز اس پر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا عمل بھی رہا اور اس بیع کی تعریف بھی فرمائی، اب آئندہ سطور میں امام ابو یوسف کے مذہب کی تائید میں اعلیٰ حضرت کی تحقیق ملاحظہ کریں:

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہ فرمایا ہے کہ بہت سے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اسے کیا اور اس کی تعریف فرمائی بغیر سند متّصل ان کا یہ بیان اصول فقہ کی اصطلاح میں حدیث مرسل ہے اس لیے کہ مرسل ہمارے نزدیک ہر وہ حدیث ہے جس کی سند متّصل نہ ہو، رہی یہ بات کہ ان کے اقسام میں فرق کیا جاتا ہے اور علاحدہ علاحدہ ان کے نام رکھے جاتے ہیں، مرسل، منقطع، مقطوع اور مُعضَل وغیرہ یہ محدثین کی اصطلاح ہے اور حکم سب کا ایک ہے وہ یہ کہ ثقہ اگر حدیث مرسل لائے تو مقبول ہے، اب امام ابو یوسف سے بڑھ کر آپ کو کون سا ثقہ درکار ہے؟ تو جب بکثرت صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے اس کا کرنا ثابت ہو گیا تو اس سے عدول نہ کیا جائے گا اس لیے کہ ہمارے امام کا مذہب یہ ہے کہ صحابۂ کرام کی تقلید کی جائے۔[1]

اس کے بعد بیع عینہ سے متعلق حدیث مذکور پر تفصیلی کلام ہے۔ روایۃً، درایۃً، سنداً، متناً ہر طرح سے تحقیقی گفتگو کی گئی ہے۔

غیر منصوص احکام کا استنباط اور جدید مسائل کی تحقیق

۱۳۲۳ھ میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ جب دوسری بار حج کے لیے گئے تو مکہ معظمہ (زادھا اللہ شرفا) کے دو مقتدر علمائے کرام "مولانا عبد اللہ احمد میرداد حنفی امام مسجد حرام اور ان کے استاذ مولانا حامد احمد محمد جدّاوی حنفی قدس

(۱) الفتاوی الرضویة، ج:۷ ص:۱۷٤.

اللہ سرّہمانے "نوٹ" جو ایک جدید اور نو پیدا چیز تھی اس کے متعلق اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ سے استفتا کیا۔ یہ استفتا بارہ سوالات پر مشتمل تھا ان تمام سوالات کو ہم ذیل کی سطور میں درج کر رہے ہیں تاکہ آئندہ کی بحثوں کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔

آپ کا کیا ارشاد ہے۔ آپ کا فضل ہمیشہ رہے۔ اس کاغذ کے باب میں جس پر سکّہ ہوتا ہے اور اسے نوٹ کہتے ہیں، اور اس میں متعدّد باتیں دریافت کرنی ہیں۔

اول: کیا وہ مال ہے یا دستاویز کی طرح کوئی سند؟

دوم: جب وہ بقدر نصاب ہو اور اس پر سال گزر جائے تو اس پر زکات واجب ہو گی یا نہیں؟

سوم: کیا اسے مہر مقرر کر سکتے ہیں؟

چہارم: اگر کوئی اسے محفوظ جگہ سے چرائے تو اس کا ہاتھ کاٹنا واجب ہو گا یا نہیں؟

پنجم: اگر اسے کوئی تلف کر دے تو عوض میں اسے نوٹ ہی دینا ہو گا یا روپے؟

ششم: کیا روپوں یا اشرفیوں یا پیسوں کے عوض اس کی بیع جائز ہے؟

ہفتم: اگر مثلاً کسی کپڑے سے اسے بدلیں تو یہ بیع مطلق ہو گی یا مقایضہ؟ (جس میں دونوں طرف متاع ہوتی ہے)

ہشتم: کیا اسے قرض دینا جائز ہے اور اگر جائز ہے تو ادا کرتے وقت نوٹ ہی دیا جائے یا روپے؟

نہم: کیا روپوں کے عوض ایک وعدۂ معینہ پر بطور قرض اس کا بیچنا جائز ہے؟

دہم: کیا اس میں بیع سلم جائز ہے؟ یوں کہ روپے پیشگی دیے جائیں کہ مثلاً ایک مہینہ کے بعد اس قسم کا اور ایسا نوٹ لیا جائے گا؟

یازدہم: کیا یہ جائز ہے کہ جتنی رقم اس میں لکھی ہے اس سے زائد کو بیچا

جائے مثلاً دس کا نوٹ بارہ یا بیس کو یا اسی طرح سے کم کو؟

دوازدہم: اگر یہ جائز ہے تو کیا یہ بھی جائز ہے کہ جب زید عمرو سے دس روپے قرض لینا چاہے، تو عمرو کہے، روپے تو میرے پاس نہیں ہیں، ہاں میں دس کا نوٹ بارہ کو سال بھر کی قسط بندی پر تیرے ہاتھ بیچتا ہوں، کہ تو ہر مہینے ایک روپیہ دیا کرے کیا اس کو منع کیا جائے گا کہ یہ سود کا حیلہ ہے اور اگر منع نہ کیا جائے تو اس میں اور ربا میں کیا فرق ہے کہ یہ حلال ہو اور وہ حرام، حالاں کہ مآل دونوں کا ایک ہے یعنی زیادتی کا ملنا۔

ہمیں جواب سے فائدہ بخشو قیامت کے دن تمھیں اجر ملے۔ (۱)

کرنسی نوٹ کے متعلق یہ بارہ سوالات تھے جو اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی خدمت میں پیش کیے گئے اس وقت وہاں نوٹ ایک نئی چیز تھی اور فقہاے کرام اس کے متعلق احکام کے بارے میں حیران و پریشان تھے۔

امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ نے ڈیڑھ دن سے کم مدت کے اندر اس حالت میں کہ بخار کا عارضہ تھا ایسا روشن اور تحقیقی جواب سپرد قرطاس فرمایا کہ یہ پیچیدہ مسائل جن کا حل نہایت دشوار تھا آفتاب سے زیادہ روشن ہوگئے علماے حرمین طیبین نے آپ کے فتاوے کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور سر آنکھوں پر رکھا۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ آپ کی بارگاہ میں استفتا سے بہت پہلے کرنسی نوٹ کے بارے میں مفتیِ اعظم مکہ **مکرمہ شیخ جمال بن عبد اللہ بن عمر حنفی** رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے بھی استفتا ہوا تھا، حضرت ممدوح کی عظمت شان اور بلند پایۂ علمی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ موصوف سند حدیث و فقہ میں اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے استاذ الاستاذ ہیں اور اپنے زمانۂ مبارک میں مفتی حنفیہ کے منصب جلیل پر فائز رہے۔

آپ نے کچھ جواب نہ دیا بلکہ علماے ربانیین کی جو شان ہے اس کے مطابق صرف اتنا تحریر فرمایا:

---

(۱) الفتاوی الرضویة، ج:۷،ص:۱۳۷، رسالہ: کفل الفقیہ الفاھم.

"العلم أمانة في أعناق العلماء والله تعالیٰ أعلم"علم علما کی گردنوں میں امانت ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم.

مذکورہ بالا جواب سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ مسئلہ اس زمانے میں کس قدر لاینحل ہو چکا تھا مگر اعلیٰ حضرت نے اپنی خداداد فقہی بصیرت سے اس کا ایسا حل تلاش فرمایا کہ علماے عرب و عجم سب ورطۂ حیرت میں پڑ گئے اور قارئین عش عش کر اٹھے۔ ان تحقیقات کی چند جھلکیاں آپ بھی ملاحظہ کریں۔

﴿۴﴾

کرنسی نوٹ کی حقیقت اور اس کا حکم

اعلیٰ حضرت سے نوٹ کے بارے میں پہلا سوال یہ ہوا تھا کہ کیا وہ مال ہے یا دستاویز کی طرح کوئی سند؟

اس کی اصل تو معلوم ہے کہ وہ کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے اور کاغذ مال متقوم (قیمت والا مال) ہے اور اس سکہ نے اسے کچھ زیادہ نہ کیا، مگر یہی کہ لوگوں کی رغبتیں اس کی طرف بڑھ گئیں اور وقت حاجت کے لیے اٹھا رکھنے کے زیادہ لائق ہو گیا اور مال کے یہی معنی ہیں یعنی وہ جس کی طرف طبیعت میل کرے، اور حاجت کے لیے اٹھا رکھنے کے قابل ہو جیسا کہ بحر و شامی وغیرہما میں ہے اور معلوم ہے کہ شرع مطہر نے کبھی مسلمان کو اس سے نہ روکا کہ اپنے پارۂ کاغذ میں جس طرح چاہے تصرف کرے جیسا کہ شراب و خوک (خنزیر) کے بارے میں نہی وارد ہوئی اور مال کے باقیمت ہونے کا اسی پر مدار ہے جیسا کہ ردالمحتار میں ہے اور اسی میں تلویح سے نقل فرمایا: "المال ما من شانه أن يدخر للانتفاع وقت الحاجة والتقويم يستلزم المالية" مال وہ چیز ہے جس کی شان یہ ہو کہ وقت حاجت اسے نفع لینے کے لیے اٹھا رکھا جائے اور قیمت والا ہونا مال ہونے کو مستلزم ہے، اور اسی میں بحوالہ بحر الرائق حاوی قدسی سے ہے، "المال اسم لغير الأدمي خلق لمصالح الأدمي وأمكن إحرازه والتصرف فيه على وجه الاختيار.اهـ" مال آدمی کے سوا ہر اس

شَے کا نام ہے جو آدمی کی مصلحتوں کے لیے پیدا کی گئی اور اس قابل ہے کہ اسے محفوظ رکھیں اور باختیار خود اس میں تصرف بھی کریں اھ[۱]

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ نوٹ ایک قیمتی مال ہے اور انسان کو اپنے پارۂ کاغذ میں جیسا چاہے تصرف کرنے کا پورا حق ہے جب نوٹ کی حقیقت معلوم ہو گئی کہ یہ مال متقوم ہے تو باقی سوالات کے جوابات بھی اسی سے حاصل ہو گئے۔

قربان جائیے اعلیٰ حضرت کی فقہی بصیرت پر، مختصر سے لفظوں میں ان تمام سوالوں کا جواب پیش فرما دیا۔

مزید ترقی کرتے ہوئے امام احمد رضا قدس اللہ سرّہ فتح القدیر کا وہ جزئیہ نقل فرماتے ہیں جس سے گیارہویں سوال کا جواب بھی ہو جاتا ہے اور اس امر کا انکشاف بھی کہ اگر غور کیا جائے تو در حقیقت یہ نوٹ کا جزئیہ ہے۔

نوٹ کا جزئیہ

آپ فرماتے ہیں وقدقال المحقق علی الإطلاق فی فتح القدیر: "ولوباع کاغذة بألف یجوز ولایُکره" اگر کوئی اپنے کاغذ کا ٹکڑا ہزار روپے کو بیچے تو بلا کراہت جائز ہے۔[۲]

ماقبل کی تصریحات سے یہ امر متیقن ہو گیا کہ نوٹ مال ہے کوئی سند یا دستاویز نہیں، بعض لوگوں کو اس کا وہم ہوا تھا کہ نوٹ دستاویز کی قبیل سے کوئی سند ہے، امام احمد رضا قدس سرہ نے پانچ وجہوں سے اس کا رد فرمایا، اور دلائل کی روشنی میں اس گمان کو باطل و مردود قرار دیا۔

نوٹ کے از قبیل تمسک ہونے کا مطلب

مجدد اعظم کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے: نوٹ کے دستاویز ہونے کا مطلب یہ ہے

(۱) الفتاوی الرضویة، ج:۷،ص:۱۳۸ رضا اکیڈمی ممبئی.

(۲) امام ابن الھمام،فتح القدیر.

کہ وہ گورنمنٹ جو ان کاغذات کو بشکل نوٹ جاری کرتی ہے ان کاغذات کے لینے والوں سے روپے (چاندی کا سکہ) قرض لیتی ہے اوران کے قرضوں اور ان کی مقداروں کی یادداشت ان کو دے دیتی ہے، جب یہ قرض خواہ لوگ گورنمنٹ کے پاس ان نوٹوں کو لے کرآتے ہیں تو گورنمنٹ ان کے قرضے ادا کر دیتی ہے اوراپنے کاغذات واپس لے لیتی ہے اور اگر یہ نوٹ لینے والے، رعایا میں سے کسی کو وہ نوٹ دیتے ہیں اوران سے روپے لیتے ہیں تو گویا یہ ان دوسروں سے قرض لیتے ہیں مگر قرض خواہ اب اپنا قرض ان دوسرے قرض داروں سے وصول نہیں کر سکتے بلکہ یہ قرض دار انھیں سلطنت کے حوالے کر دیتے ہیں کہ وہ اپنا قرض گورنمنٹ سے وصول کریں اور اس حوالہ کی نشانی کو وہی یادداشت ان کو دے دیتے ہیں، یہ ہے نوٹ کے سند اور دستاویز ہونے کا مطلب — اسی طرح جتنے الٹ پھیر نوٹوں کے ہوتے جائیں گے قرض اور حوالے مکرر ہوتے جائیں گے۔ (۱)

کیا مذکورہ بالا باتیں نوٹ پر صادق آرہی ہیں یا نہیں؟ صورت اول پر اعلیٰ حضرت نے پانچ وجہوں سے کلام فرمایا:

﴿۲﴾

نوٹ کے سند ہونے پر پانچ وجہوں سے کلام

وجہ اول: ہر سمجھ دار بچہ جانتا ہے کہ جتنے لوگ نوٹوں کا معاملہ کرتے ہیں کسی کے دل میں ان باتوں کا خطرہ بھی نہیں گزرتا اور کبھی بھی اس تبادلے سے یہ نہیں سمجھتے کہ ہم دوسرے کو قرض دے رہے ہیں یا قرض لے رہے ہیں یا حوالہ کر رہے ہیں۔ (۲) ملخصاً

وجہ دوم: ایسا کبھی نہیں دیکھا گیا کہ کوئی اپنے قرض کے کھاتے میں اس کا نام لکھتا ہو جس نے نوٹ دے کر اس سے روپے لیے، اور زندگی میں کبھی بھی اس سے یہ

---

(۱) الفتاوی الرضویة، ج:۷،ص:۱۲۹.

(۲) الفتاوی الرضویة، ج:۷،ص:۱۲۹.

نہیں کہتا کہ تونے مجھ سے قرض لیا ہے ادا کر دے اور اپنی یادداشت مجھ سے لے لے۔ (ملخصاً ومترجماً)

وجہ سوم: اور جو اوروں کا اس پر دینا آتا ہے اس میں بھی اس کا نام کبھی نہیں لکھتا جسے نوٹ دے کر اس سے اس نے روپے لیے نہ کبھی زندگی بھر یا مرتے دم یہ کہتا ہے کہ فلاں کا مجھ پر اتنا آتا ہے اسے ادا کر دینا اور میری یادداشت مجھ سے لے لینا۔ (ملخصاً ومترجماً)

وجہ چہارم: نوٹ دے کر روپے حاصل کرنا اگر قرض قرار پائے تو پھر وہ ظالم و بے باک جو علانیہ طور پر سود کھانے کے عادی ہو چکے ہیں ہر گز ایک روپیہ بھی قرض نہ دیں گے جب تک تاادائے دین، اس پر ماہ وار سود مقرر نہ کر لیں، حالاں کہ انھیں دیکھو گے کہ نوٹ لے کر روپے دیتے ہیں اور اس پر ایک پیسہ بھی نہیں مانگتے، نہ مہینہ پیچھے، نہ برسوں آگے۔ اور اگر وہ جانتے کہ یہ قرض دینا ہے تو ہر گز نہ چھوڑتے۔

وجہ پنجم: حق یہ ہے کہ وہ سب کے سب اس سے مبادلہ اور خرید و فروخت ہی کا قصد کرتے ہیں، جو نوٹ رکھتا ہے وہ یقیناً جانتا ہے کہ میں روپے دے کر اس کا مالک ہو گیا اور جو نوٹ دیتا ہے وہ یقیناً جانتا ہے کہ میں نے روپے لے کر نوٹ کو اپنی ملک سے خارج کر دیا۔

اور نوٹ لینے والا اسے روپوں اشرفیوں پیسوں کی طرح اپنا مال اور اپنی جمع سمجھتا ہے اور اسے جوڑ کر رکھتا ہے اس میں ہبہ کرتا ہے، وصیت کرتا ہے اور تصدق کرتا ہے۔ الخ[1]

امام احمد رضا قادری قدس سرہ نے قوی استدلال اور مضبوط دلائل سے اس مسئلہ کو بالکل واضح اور منقح فرما دیا کہ کرنسی نوٹ کوئی سند نہیں ہے بلکہ قیمت والا مال ہے، ان ارشادات سے دیوبندیوں کے مولوی رشید احمد گنگوہی کے فتوے کا

(۱) الفتاوی الرضویة، ج:۷،ص:۱۲۹-۱۳۰.

بھی پر زور رد ہو جاتا ہے جس میں نوٹ کو تمسک ٹھہرا کر سرے سے مال ہونے سے خارج کر دیا اور کمی بیشی تو در کنار برابری کے ساتھ بھی خرید و فروخت کو ناجائز قرار دیا گیا ہے، اس رسالہ کو تصنیف کرتے وقت مولوی رشید احمد گنگوہی کا خلاف معلوم نہ تھا مگر پھر بھی بالہام الٰہی بقدر کفایت ایسی بحث فرمائی کہ گنگوہی صاحب کے دلائل هباء منثورا ہو گئے۔

بعد میں اس کے اور مولوی عبد الحی صاحب لکھنوی کے رد میں ایک مستقل رسالہ "كاسر السفيه الواهم في إبدال قرطاس الدراهم" تصنیف کیا۔

﴿۳﴾

ایک روپے کا نوٹ سو روپے میں باہمی رضامندی سے بیچنا جائز ہے، سود نہیں ہوگا

کرنسی نوٹ نو پید اور ایک حادث چیز ہے اس کے پیدا ہونے کے ساتھ یہ سوال پیدا ہوا کہ وہ کاغذی نوٹ جسے ہم اپنی اصطلاح میں "ثمن" سمجھتے ہیں اگر چاندی کے روپے کے ساتھ اس کی بیع ہو جو ثمن خلقی ہے تو زیادتی کے ساتھ یا کمی کے ساتھ بیع جائز ہے یا نہیں؟

اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ نے اس کا حکم واضح فرمایا کہ نوٹ پر جتنی رقم لکھی ہے اس سے زیادہ یا کم کو جتنے پر رضامندی ہو جائے اس کا بیچنا جائز ہے، اس لیے کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ نوٹ کا ان مقداروں سے اندازہ کرنا صرف لوگوں کی اصطلاح سے پیدا ہوا ہے اور بائع و مشتری پر کسی دوسرے کو کوئی ولایت حاصل نہیں جیسا کہ ہدایہ و فتح القدیر میں ہے، تو ان دونوں کو اختیار ہے کہ کم یا زیادہ جتنا چاہیں مقرر کر لیں، اصل عبارت یہ ہے۔

فأقول نعم يجوز بيعه بأزيد من رقمه وبأنقص منه كيفما تراضيا لما علمت أن تقديرها بهذه المقادير إنما حدث باصطلاح الناس وهما لا ولاية للغير عليهما كما تقدم عن الهداية والفتح

فلهما أن يقدرا بماشاءا من نقص و زيادة.اهـ.[1]

کرنسی نوٹ میں قدر و جنس دونوں مفقود

اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت فرمادیا کہ کرنسی نوٹ میں قدر و جنس دونوں مفقود ہیں، لہٰذا یہ سودی مال کی قبیل سے ہے ہی نہیں کہ اس میں سود ہو، چند نقلی و عقلی دلائل سے آپ نے اس کا حکم واضح فرمایا ہے، ذیل کی سطور میں چند دلائل پیش کیے جاتے ہیں:

پہلی نقلی دلیل: ہمارے تمام علمائے کرام نے یہ صراحت فرمائی ہے کہ حرمت ربا کی علت وہ خاص اندازہ یعنی ناپ یا تول ہے اتحاد جنس کے ساتھ تو اگر قدر و جنس دونوں پائے جائیں تو بیشی اور ادھار دونوں حرام ہیں اور اگر دونوں نہ پائی جائیں تو حلال ہیں اور اگر دونوں میں سے ایک پائی جائے تو بیشی حلال اور ادھار حرام ہے اور یہ ایک عام قاعدہ ہے جو کہیں بھی منتقض نہیں، اور باب ربا کے جمیع مسائل اسی پر دائر ہیں۔

یہ معلوم ہے کہ نوٹ اور روپیوں میں شرکت نہ قدر میں ہے نہ جنس میں، جنس میں تو اس لیے نہیں کہ یہ کاغذ ہے اور وہ چاندی، اور قدر میں اس لیے نہیں کہ روپے تول کی چیز ہیں اور نوٹ نہ تول کی نہ ناپ کی تو واجب ہوا کہ بیشی اور ادھار دونوں جائز ہوں، تو ظاہر ہوا کہ نوٹ سرے سے مال ربا سے ہی نہیں۔[2]

دوسری دلیل: قال فی ردالمحتار وغیرہ کلما حرم الفضل حرم النسأ ولاعکس وکلما حل النسأ حل الفضل ولاعکس.اھ.

ردالمحتار وغیرہ میں فرمایا جہاں بیشی حرام ہوتی ہے وہاں ادھار بھی حرام ہے اس کا عکس نہیں اور جہاں ادھار حلال ہو وہاں بیشی بھی حلال ہوتی ہے اس کا عکس نہیں۔

وقد أقمنا البرهان القاطع فی جواب التاسع علی حل النسأ

(۱) الفتاوی الرضویة، ج:۷،ص:۱۶۰-۱۶۱.

(۲) الفتاوی الرضویة، ج:۷،ص: ۱۶۱.

هھنا فوجب حل الفضل.اھ.

اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: کہ نویں سوال کے جواب میں ہم دلیل قطعی قائم کر چکے ہیں کہ نوٹ میں ادھار جائز ہے تو واجب ہوا کہ بیشی بھی حلال ہو۔

صاحب ردالمحتار یہ فرماتے ہیں کہ جہاں ادھار حلال ہے وہاں بیشی بھی حلال ہے ،اور اعلیٰ حضرت نے جب پہلے یہ ثابت کر دیا کہ نوٹ میں ادھار جائز ہے تو واجب ہوا کہ زیادتی بھی حلال ہو۔

تیسری دلیل: حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "إذا اختلفت هذه الأصناف فبيعوا كيف شئتم رواه مسلم عن عبادة بن الصامت رضى الله تعالى عنه فمن الحاجر بعد إذن رسول الله صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم".

جب جنس مختلف ہو تو جیسے چاہو بیچو، یہ حدیث صحیح مسلم میں عبادہ بن صامت □ سے مروی ہے، تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اجازت کے بعد منع کرنے والا کون ہے۔

جب یہ ثابت ہو چکا کہ نوٹ کی جنس الگ ہے اور روپے کی الگ تو تفاضل یا ادھار کی صورت میں بیع کیوں حرام ہو گی؟

چوتھی دلیل: ہر عقل مند یہ جانتا ہے کہ وہ مال جو عام بھاؤ سے سب کے نزدیک دس روپے کی قیمت کا ہے ہر شخص کو روا ہے کہ خریدار کی رضامندی سے اسے سو روپے کو بیچے یا ایک ہی پیسے میں بیچ دے۔ من جانب الشرع اس پر کوئی روک نہیں بلکہ قرآن مبین خود اس پر ناطق ہے۔ إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم. اے مسلمانو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ مگر یہ کہ کوئی سودا ہو باہمی رضامندی کا۔ (تو وہ تمھارے لیے حلال ہے) (نساء آیت:۲۹)

فتح القدیر میں محقق ابن الہمام رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

لو باع كاغذة بألف يجوز ولا يُكره. یعنی ایک کاغذ ایک ہزار میں بیچا تو جائز ہے اور اصلاً مکروہ بھی نہیں اور ہر شخص یہ جانتا ہے کہ کاغذ کے ایک ٹکڑے کی

قیمت ہر گز نہ ہزار تک پہنچتی ہے نہ سو تک نہ ایک روپے تک، تو اس کا سبب یہی ہے کہ قیمت اور ثمن جدا جدا چیزیں ہیں اور بائع و مشتری پر قیمت (یعنی بازار بھاؤ) کی پابندی ثمن میں لازم نہیں (ثمن وہ ہے جو ان کے درمیان باہم طے پایا) بلکہ انھیں اختیار ہے کہ بازار کے بھاؤ سے کئی گنا زائد پر رضا مندی کرلیں یا اس کے سوویں حصے پر۔[1]

اعتراض: اعلیٰ حضرت کے مذکورۂ بالا دلائل پر یہ اعتراض واقع ہو سکتا ہے کہ آپ نے جو بیان فرمایا وہ متاع کا حکم ہے اور نوٹ تو اصطلاح میں ثمن ہے لہٰذا حکمِ متاع، ثمن پر کیسے جاری ہو سکتا ہے؟

امام احمد رضا کا جواب:

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں: معترض نے تو خود ہی یہ کہہ کر کہ یہ اصطلاح میں ثمن ہے اس کا جواب ظاہر کر دیا، جب یہ اصطلاحی ثمن ہے تو اوروں کی اصطلاح عاقدین کو عدم ابطال ثمنیت پر مجبور نہیں کرتی یہ ممکن ہے کہ وہ ثمنیت کو باطل قرار دیں، اور اگر یہ مان بھی لیتے ہیں کہ عاقدین ابطال ثمنیت پر قادر نہیں تو یہ قاعدہ کہاں سے نکالا کہ اصطلاحی ثمنوں کی مقدار مصطلح سے تغییر جائز نہیں۔ کیا نہیں دیکھتے کہ ایک روپے کے پیسے عرف کی تعیین سے ہمیشہ متعیّن ہوتے ہیں اس کی دلیل یہ ہے کہ ہر سمجھ دار بچہ جانتا ہے کہ ایک روپیہ سولہ آنے کا ہے۔ نہ پندرہ کا نہ سترہ کا۔ پھر یہ عرفی تعیین اور پیسوں کا ثمن اصطلاحی ہونا بائع و مشتری پر کمی بیشی حرام نہیں کرتا۔ در مختار و تنویر الابصار میں فرمایا جس نے صرّاف کو ایک روپیہ دیا اور کہا کہ اس کے عوض مجھے آٹھ آنے کے پیسے دے دو اور ایک سکہ جو اٹھنی سے رتّی بھر کم ہو تو ایسی بیع جائز ہے اس لیے کہ روپے کی اتنی چاندی جو اس چھوٹے سکہ کے برابر ہو وہ تو اس سکہ کے عوض رہے گی اور باقی کے عوض پیسے۔

---

(۱) الفتاوی الرضویة، ج:۷،ص: ۱۶۲ ،رساله: كفل الفقيه الفاهم.

اور ہدایہ کی عبارت تو یہ ہے "لوقال أعطني نصف درهم فلوسا و نصفا إلا حبة جاز "اھ. اگر کہا آٹھ آنے پیسے دے دو اور رتی کم اٹھنی تو جائز ہے۔

مزید تقویت کے لیے فرماتے ہیں: یہ تو ثمن اصطلاحی کی بات تھی آئیے ثمن خلقی کی طرف۔ سونا چاندی کہ اصل پیدائش کے اعتبار سے ثمن ہیں اور کوئی شخص ان کی ثمنیت باطل کرنے پر قادر نہیں، اور ہر عاقل یہ جانتا ہے کہ اشرفی ہمیشہ کئی روپے کی ہوتی ہے اور ہر گز کوئی اشرفی ایسی نہیں پائی جائے گی جو ایک روپے کی قیمت کی ہو اس کے باوجود ہمارے ائمہ نے تصریح فرمائی ہے کہ ایک اشرفی ایک روپے کو بیچنا صحیح ہے اس میں اصلاً ربا نہیں اس کا سبب یہی ہے کہ جب جنس مختلف ہوں تو جیسے چاہو بیچو، اور نوٹ اور روپے کا مختلف الجنس ہونا ایسی بات ہے جس سے کوئی مجنون ہی ناواقف ہوگا، ہدایہ، در مختار اور عام کتابوں میں یہی کہا گیا ہے کہ دو روپے اور ایک اشرفی کو ایک روپے اور دو اشرفی کے عوض بیچنا درست ہے، اور اس کے درست ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہر جنس اپنے مقابل جنس کے ساتھ کر دی جائے گی مثلاً دو روپے دو اشرفی کے مقابل اور ایک روپیہ ایک اشرفی کے مقابل۔[1]

مذکورہ بالا تصریحات سے امام احمد رضا قدس سرہ نے کتب فقہ کے متعدّد جزئیات کی روشنی میں اس عقدہ کو واشگاف فرمادیا کہ ثمنیت اصطلاحی کی متعیّنہ مقدار سے کمی وبیشی عاقدین کی رضا سے جائز و درست، بلکہ یہ بات تو ثمن خلقی و حقیقی میں بھی جائز ہے جس کی ثمنیت کو اللہ تعالیٰ نے واجب قرار دیا ہے، اگر کوئی چاہے کہ دو اشرفی کو ایک درہم چاندی کے عوض بیچے تو ایسا کرنا درست ہے اس میں کوئی قباحت نہیں، سرکار دوعالم ﷺ کا فرمان عالی شان ہے کہ جب اشیا کی اَصناف مختلف ہوجائیں تو کمی یا زیادتی جس طرح چاہو بیچو، لہٰذا معترض کا وہ اعتراض پورے طور پر رفع ہوگیا۔

---

(۱) الفتاوى الرضوية، ج:۷،ص: ۱٦۲، رسالة كفل الفقيه الفاهم.

﴿۴﴾

کرنسی نوٹ میں بیع سلم جائز ہے

کیا کرنسی نوٹ میں بیع سلم جائز ہے یا نہیں بایں طور کہ روپے پیشگی دے دیے جائیں کہ مثلاً ایک مہینے کے بعد اس قسم کا اور ایسا نوٹ لیا جائے گا؟

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ فرماتے ہیں: ''فأقول نعم يجوز السلم فى النوط وقد يقال لا يجوز فإنه ثمن ولاسلم فى الأثمان كما تقدم عن النهر'' الخ.

اعلیٰ حضرت کے جواب اور تحقیقات کا حاصل یہ ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ ہاں! نوٹ میں سلم جائز ہے یہ بھی کہا گیا کہ جائز نہیں اس لیے کہ نوٹ ثمن ہیں اور ثمن میں بدلی جائز نہیں جیسا کہ نہر سے گزرا، اور تحقیق یہ ہے کہ یہ قول صرف ایک روایت نادرہ کی بنیاد پر ہے جو امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منقول ہے ورنہ متون میں تو یہ تصریح ہے کہ پیسوں میں سلم (بدلی) جائز ہے ہاں! جو خلقی طور پر ثمن ہیں ان میں سلم جائز نہیں اور یہ صرف سونا اور چاندی ہیں۔

(۱) تنویر الابصار و در مختار میں ہے: (يصح أي السلم فيما أمكن ضبط صفته) كجودته ورداءته (ومعرفة قدره كمكيل و موزون) وخرج بقوله (مثمن) الدراهم والدنانير لأنها أثمان فلم يجزفيهما السلم خلافا لمالك (أوعددى متقارب كجوز و بيض وفلس) الخ.

سلم جائز ہے ہر اس چیز میں جس کی صفت کا انضباط ہو سکے جیسے اس کا کھرا کھوٹا ہونا اور اس کا اندازہ پہچان سکیں جیسے ناپ اور تول کی چیز اور یہ جو مصنف نے فرمایا کہ وہ چیز ثمن نہ ہو اس سے روپے اور اشرفی نکل گئے اس لیے کہ وہ ثمن ہیں تو ان میں تبدیلی جائز نہیں اس میں امام مالک کا خلاف ہے، یا گنتی سے بکنے کی چیز ہو تو ایسی ہو کہ اس کے افراد باہم قریب قریب ہوتے ہیں جیسے اخروٹ، انڈے اور پیسے الخ۔[1]

---

(۱) الفتاوى الرضوية، ج:۷،ص: ۱۵۸.

(۲) ہدایہ میں ہے:وکذا فی الفلوس عددا وقیل هذا عند أبی حنیفة وأبی یوسف رحمهماالله تعالیٰ و عند محمد لا یجوز لأنهما أثمان ولهما أن الثمنية فی حقهما باصطلاحهما فتبطل باصطلاحهما قال فی الفتح أی یجوز السلم فی الفلوس عددا.

ہدایہ میں ہے یوں ہی پیسوں میں بدلی جائز ہے ان کی گنتی مقرر کر کے اور کہا گیا ہے کہ یہ امام اعظم اور امام ابو یوسف کے نزدیک ہے، اور امام محمد کے نزدیک جائز نہیں اس لیے کہ پیسے ثمن ہیں اور شیخین کی دلیل یہ ہے کہ ثمن ہونا بائع ومشتری کے حق میں ان کی اصطلاح کی بنیاد پر ہے، تو ان دونوں کی اصطلاح سے باطل بھی ہو جائے گا۔

(۳) فتح القدیر میں محقق ابن الہمام نے فرمایا پیسوں میں گنتی سے بیع سلم جائز ہے۔اس کے بعد اعلیٰ حضرت رقم طراز ہیں:

هکذا ذکره محمد رحمه الله تعالیٰ فی الجامع من غیر ذکر خلاف فکان هذا ظاهر الروایة عنه وقیل بل هذا قول أبی حنیفة وأبی یوسف أما عنده فلا یجوز بدلیل منعه بیع الفلس بالفلسین.[۱]

اسی طرح امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے جامع میں ذکر فرمایا اور کسی خلاف کا نام نہ لیا تو یہی روایت امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے روایت مشہورہ ہوئی، اور بعض نے یہ کہا کہ یہ قول شیخین کا ہے، امام محمد اس کے قائل نہیں اس لیے کہ وہ دو پیسوں کو ایک پیسہ کے عوض بیچنا منع فرماتے ہیں، ان کی دلیل یہی ہے کہ وہ ثمن ہیں اور جب ثمن ہیں تو ان میں بدلی جائز نہ ہوئی۔

اس کے بعد اعلیٰ حضرت اپنی تحقیق پیش فرماتے ہیں:

روایت مشہورہ جو امام محمد سے منقول ہے اس میں جواز ہی مروی ہے البتہ وہ

(۱) الفتاوی الرضویة، ج:۷،ص: ۱۵۸.

بیع اور بیع سلم میں فرق کرتے ہیں کہ سلم میں یہ امر ضروری ہے کہ جو چیز وعدہ پر لینی ٹھہرے وہ ثمن نہ ہو تو جب انھوں نے پیسوں کی بدلی پر اقدام کیا تو ضمناً ان کی اصطلاح ثمنیت کو باطل کر دیا اور ان کی بدلی اسی طور پر جائز ہے جس طرح ان میں معاملہ کیا جاتا ہے یعنی گن کر بر خلاف بیع کے کہ وہ ثمن پر بھی وارد ہو سکتی ہے تو بیع میں ان کو ثمنیت سے خارج کرنے کا کوئی موجب نہیں پس کمی بیشی جائز نہ ہوئی اور ایک پیسے کی دو پیسے سے بیع منع ٹھہری۔

مگر اس فرق پر اعتراض ہے اس لیے کہ امام محمد اس کے قائل ہی نہیں کہ صرف عاقدین کے ارادہ ہی سے وہ ثمنیت سے خارج ہو جائیں حالاں کہ باقی تمام لوگ ان کے ثمن ہونے پر متفق ہیں، ہدایہ میں فرمایا کہ امام اعظم و امام ابو یوسف کے نزدیک ایک پیسہ دو معین پیسے کے عوض بیچنا جائز ہے اور امام محمد □ نے فرمایا جائز نہیں اس لیے کہ ان کا ثمن ہونا سب لوگوں کی اصطلاح سے ثابت ہوا تھا تو صرف ان دو کی اصطلاح سے باطل نہ ہو گا، اور جب وہ ثمنیت پر باقی ہیں تو متعین نہ ہوں گے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک پیسہ دو غیر معین پیسے کے بدلے میں بیچ لیا اور جیسے ایک معین روپیہ دو غیر معین روپے کے بدلے میں بیچا۔

اور شیخین کی دلیل یہ ہے کہ ثمنیت عاقدین کے حق میں ان کی اصطلاح سے ثابت ہوتی ہے (آخر تقریر سابق تک)، اور محقق علام نے اسے برقرار رکھا اور اسی طور پر اس کی تقریر فرمائی تو امام محمد یہاں کس طرح فرمائیں گے کہ عاقدین کا ان کی بدلی پر اقدام کرنا ان کی اصطلاحِ ثمنیت کو باطل مان لینا ہے مگر یہ کہا جائے کہ یہ ان کی پہلی تعلیل سے رجوع ہے اور وہ تعلیل خود امام محمد سے منقول نہ تھی، مشائخ نے پیدا کی تھی نیز اس فرق سے ظاہر ہو گیا کہ امام محمد کے نزدیک وجہ وہ نہیں تھی بلکہ وہ بھی اسی کے قائل ہیں کہ عاقدین کو اپنے حق میں ثمنیت باطل کرنے کا اختیار ہے مگر یہ اس وقت ہے کہ جب عاقدین سے ثمنیت باطل کرنے کا ارادہ ثابت ہو جائے اور وہ بدلی (سَلَم) میں ضرور ثابت ہو گیا اس لیے کہ اس میں جو چیز وعدہ پر لینی ٹھہری ہے وہ کبھی ثمن

نہیں ہو سکتی تو پیسوں میں بدلی پر ان کا اِقدام ثمنیت باطل کرنے پر دلیل ہے اور بیع میں ان کا یہ ارادہ ثابت نہ ہوا اس لیے کہ اس میں مبیع کا ثمن نہ ہونا کچھ ضرور نہیں تو عاقدین سے ابطال اصلاح ثابت نہ ہوا، تو پیسے بحال خود ثمن رہے تو متعیّن نہ ہوئے تو بیع باطل ہوئی۔ الخ۔[۱]

﴿۵﴾

کمپنی کے حصص کی بیع و شرا کا حکم

ہمارے زمانے میں ٹرام وے، ریلوے کمپنی، اور دوسرے کارخانوں کے حصص جسے یہاں کی اصطلاح میں شیئر کہتے ہیں خریدے جاتے ہیں اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کپڑا بننے یا آہن سازی یا کسی اور تجارت کے لیے کوئی کمپنی قائم کی جاتی ہے اور اس پوری کمپنی کا سرمایہ مقرر کر کے اس کے حِصَص فروخت کیے جاتے ہیں خرید لینے کے بعد وہ اس کے نفع و نقصان دونوں میں شریک ہوتے ہیں، اب جو نفع ملتا ہے بقدر حصۂ رسدی تمام شرکا میں تقسیم ہوتا ہے اور کچھ روپیہ نفع میں سے جمع بھی ہوتا رہتا ہے جو سود پر بھی دیا جاتا ہے اور اس کا سود بھی نفع میں شامل کر کے حصہ داروں کو دیا جاتا ہے اور ضرورت کے وقت سودی روپیہ بھی لیا جاتا ہے اس کا سود اصل رقم یا نفع میں سے دیا جاتا ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ یہ حِصَص خریدنا عند الشرع جائز ہے یا نہیں اور اگر جائز ہے تو کس بیع میں داخل ہے اور اس میں زکات حصص کی قیمت پر لازم ہوگی یا منافع پر؟

صورت مسئلہ یہ تھی اس کا بہت ہی مختصر اور جامع جواب اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے ارشاد فرمایا:

ظاہر ہے کہ حصہ روپوں کا ہے اور وہ اتنے ہی روپوں کا بیچا جائے گا جتنے کا حصہ

---

(۱) الفتاوی الرضویة، الجلد السابع، ص: ۱۵۹-۱۶۰.

ہے یا کم زائد کا بیچا گیا تو رِبا اور حرام قطعی ہے اور اگر مساوی ہی کو بیچا گیا تو صَرف ہے جس میں تقابض بدلین نہ ہوا، یوں حرام ہے پھر حصہ داروں کو جو منافع کا سود دیا جاتا ہے وہ بھی حرام ہے غرض یہ معاملہ حرام در حرام محض حرام ہے۔ حصص کی قیمت شرعاً کوئی چیز نہیں بلکہ اصل کے روپے جتنے اس کی کمپنی میں جمع ہیں یا مال میں اس کا جتنا حصہ ہے یا منفعت جائزہ غیر ربا میں اس کا جتنا حصہ ہے اس پر زکات لازم آئے گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم.[۱]

﴿٦﴾

سیونگ بینک کی زائد رقم کا حکم

صورت مسئلہ: سیونگ یعنی ڈاک خانہ جات سرکاری میں روپیہ جمع کرنا اور اس کا سود ۴؍ فیصدی جو حسب قاعدہ سرکاری جمع کنندہ کو ملتا ہے لینا جائز ہے یا نہیں؟

اس کے جواب میں امام اہل سنت فرماتے ہیں: سود مطلقاً حرام ہے "قال اللہ تعالیٰ و حرم الربا" ہاں! اگر کوئی اپنا مطالبہ واجبہ یا مباحہ جائزہ زید پر آتا ہو اور ویسے نہ ملے تو صرف بقدر مطالبہ جس طریقہ کے نام سے مل سکے لے سکتا ہے کہ اس صورت میں یہ اپنا حق لیتا ہے نہ کہ کوئی ناجائز چیز۔ دینے والے کا اسے ناجائز نام سے تعبیر کرنا یا سمجھنا اسے مضر نہ ہوگا جب کہ اس کی نیت صحیح اور حق جائز و واجبی ہے واللہ یعلم السِّرَّ وَ أخفی اس امر میں مسلم وغیر مسلم سب کا حکم یکساں ہے بشرطے کہ غدر نہ کرے فتنہ نہ ہو۔[۲]

تخریج احادیث

کسی حدیث کو نقل کرنے کے بعد اس کے راوی کا پتا دینا اور یہ ظاہر کرنا کہ ائمہ فقہ و حدیث میں سے ان ان حضرات نے اپنی کتابوں میں اس کی روایت فرمائی ہے،

---

(۱) الفتاوی الرضویة، ج:۷،ص: ۱۱۱-۱۱۲.

(۲) الفتاوی الرضویة، ج:۷،ص: ۱۸۸.

اور کہیں اختلاف الفاظ ہے تو فلاں محدث نے فلاں باب میں ان لفظوں کے ساتھ اور فلاں نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے یہ تخریج احادیث ہے، لیکن یہ طرز قدیم ہے جدید طرز تخریج میں ان سب کے علاوہ جلد، صفحہ، مطبع اور سال اشاعت کا اضافہ بھی کیا جاتا ہے۔

یہ کام اتنا اہم اور مشکل ہے کہ اسے علم حدیث میں مستقل ایک فن کی حیثیت حاصل ہے، اس کے لیے بے پناہ وسعت مطالعہ، حیرت انگیز ضبط و استحضار اور غیر معمولی قوت حافظہ درکار ہے۔

قدیم طرز تخریج کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے جب ہم اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی تخریجات پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ان کی وسعت مطالعہ، غیر معمولی ضبط و استحضار اور بے مثال قوت حافظہ پر حیرت ہوتی ہے کہ بسا اوقات ایک ایک حدیث کی تخریج میں دس دس بارہ اور کبھی اس سے بھی زائد کتب احادیث کا حوالہ پیش فرماتے ہیں اور اس محد ثانہ شان کے ساتھ کہ فلاں امام نے فلاں صحابی سے اپنی کتاب میں ان لفظوں کے ساتھ اور فلاں نے ان لفظوں کے ساتھ روایت کیا ہے، یہ عمدہ روش اگلوں کے یہاں تو ہمیں ملتی ہے لیکن بعد والوں میں نایاب یا کم یاب ہے۔

اس نوع کے سینکڑوں مقامات آپ کے فتاوی میں مذکور ہیں، یہاں بطور نمونہ چند شواہد فتاوی رضویہ جلد ہفتم سے نذر قارئین ہیں:

﴿۱﴾

حدیث پاک ”لعن اللہ أکل الربا و موکلہ الخ“ کی تخریج

سود کھانے، کھلانے اور اس میں معاون بننے والوں کی مذمت میں سرکار دوجہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لعن الله أكل الربا ومؤكله وكاتبه وشاهدهٗ.

اللہ عزوجل نے سود کھانے اور کھلانے والے، اس کا کاغذ لکھنے والے اور اس

پر گواہ بننے والے پر لعنت فرمائی، اس حدیث کو نقل فرمانے کے بعد لکھتے ہیں:
رواه أحمد و أبوداؤد و الترمذي و ابن ماجه والطبرانی فی الکبیر وزاد "وهم لایعلمون" کلهم عن ابن مسعود رضی الله عنه، ونحوه عند أحمد والنسائی عن علی کرم الله وجهه، سنداهما صحیحان، وبمعناه عند مسلم فی صحیحه وزاد "وهم سواء" .اهـ.[۱]

اس حدیث کو امام احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور طبرانی نے معجم کبیر میں روایت کیا ہے لیکن طبرانی نے اتنا اور اضافہ کیا وهم لایعلمون ان حضرات نے ح ضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے اور امام احمد اور نسائی کے نزدیک اسی کے مثل حدیث حضرت سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے دونوں کی سندیں صحیح ہ یں، اور اسی کے ہم معنی امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیا اور اتنا اضافہ کیا کہ وہ سب برابر ہیں۔

مذکور حدیث کی تخریج میں امام احمد رضا قدس سرہ نے درج ذیل امور کی صراحت فرمائی ہے:

(۱) مذکورہ چار محدثین کرام نے انھیں لفظوں کے ساتھ روایت کی ہے جو اوپر مذکور ہیں اور امام طبرانی نے "وهم لایعلمون" کے اضافہ کے ساتھ روایت کیا۔

(۲) یہ حدیث حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔

(۳) امام احمد اور نسائی سے اسی کے مثل روایت دوسرے صحابی سے مروی ہے۔

(۴) وہ دونوں روایتیں جو امام احمد و نسائی سے منقول ہیں ان کی سندیں کس درجہ کی ہیں، ضعیف یا حسن یا صحیح؟ تو صحیح فرما کر ان کا درجہ اور مقام معین فرما دیا۔

(۱) الفتاوی الرضویة، ج:۷،ص: ۸۲.

(۵) کچھ اضافے کے ساتھ اسی کے ہم معنی حدیث امام مسلم سے بھی منقول ہے۔

یہ ہے اعلیٰ حضرت کی شانِ تخریج اور قوت امتیاز کہ ایک ہی متن کی حدیث کن کن کتابوں میں کن الفاظ کے ساتھ مروی ہے سب کو آپ نے آئینہ کی طرح واضح فرمادیا جس سے اِلتباس واِشتباہ کا راستہ بھی بند ہو گیا۔

﴿۲﴾

حدیث ”زن وارجح“ کی تخریج

ایک بار نبی اکرم ﷺ نے ایک وزن کرنے والے سے فرمایا:

”زن وارجح“ وزن کرو اور جھکادو، (یعنی وزن کرنے میں ترازو کو قدرے جھکادو) یہ حکم بطور احسان و مروت تھا وجوبی نہیں تھا۔

اس روایت کو نقل فرمانے کے بعد اعلیٰ حضرت نے جب اس کی تخریج کی طرف التفات کی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علم کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر رہے جس سے علم و حکمت اور تحقیق و تدقیق کے بے شمار چشمے پھوٹ رہے ہیں، آپ فرماتے ہیں:

رواه أحمد والأربعة وابن حبان، والحاكم عن سويد بن قيس العبدي رضى الله تعالىٰ عنه قال الترمذى: حسن صحيح و قال الحاكم: صحيح و هٰذا الوزّان فى مكة، ورواه الطبرانى فى الأوسط وأبو يعلى فى المسند وابن عساكر عن أبى هريرة رضى الله تعالىٰ عنه وهٰذا الوزّان فى المدينة.

اس حدیث کو امام احمد، صاحب سنن اربعہ (ابن ماجہ، ابوداؤد، ترمذی، نسائی) اور حاکم نے سوید بن قیس عبدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راویت کیا، امام ترمذی نے کہا یہ حسن صحیح ہے، اور حاکم نے کہا صحیح ہے، اور یہ وزن کرنے والا مکہ مکرمہ میں تھا، اور اس کو طبرانی نے اوسط میں، اور ابو یعلیٰ نے مسند میں، ، اور ابن عساکر نے حضرت ابو ہریرہ

رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اور ان کے مطابق یہ پیمائش کرنے والے مدینہ منورہ میں تھے۔[1]

اس مختصر سی عبارت میں بہت ساری چیزوں کی نشان دہی فرمادی، اور یہ بھی واضح فرمادیا کہ محدثین نے اس کا کیا حکم متعیّن فرمایا ہے۔

﴿۳﴾

حدیث "إذا كانت عنده امرأتان الخ" کی تخریج

جس کے پاس دو بیویاں ہوں اور وہ ان کے درمیان عدل نہ کرتا ہو تو اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إذا كانت عنده امرأتان فلم يعدل بينهما جاء يوم القيمة وشقه ساقط.

جس کے پاس دو بیویاں ہوں اور وہ ان کے مابین انصاف نہ کرے تو بروز قیامت اس حال میں آئے گا کہ اس کا ایک پہلو گرا ہوا ہوگا۔

رواه الترمذی، وابوداؤد، و النسائی، و ابن ماجه، و ابن حبان، والحاکم عن ابی هريرة رضی الله تعالی عنه.

علم حدیث میں کمال اور قوتِ اِستنباط واِستدلال

ایک کامل فقیہ کے لیے جس طرح مختلف علوم وفنون میں مہارت ضروری ہے اسی طرح علم حدیث میں غیر معمولی دست رس ہونا امر لازم اور بدیہی چیز ہے، اس لیے کہ علم حدیث میں رسوخ کے بغیر کوئی فقیہ نہیں ہو سکتا لیکن فقاہت کے بغیر محدث ہو سکتا ہے۔

(۱) الفتاوی الرضویة ج:۷،ص: ۹۰.

علم حدیث میں امام احمد رضا قدس سرہ کی مہارت و رسوخ کا اندازہ ان کی تصانیف اور فتاوی کے مطالعہ سے ہوتا ہے، یہاں چند نظائر و شواہد پیش کیے جارہے ہیں ملاحظہ کریں۔

﴿۱﴾

سود کی حرمت و مذمت پر ۲۸/ احادیث مبارکہ

مجدد اعظم اعلیٰ حضرت قدس سرہ سے ایک سوال ہوا کہ کسی شخص نے یہ کہا کہ سود کھانا اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنے سے بدتر ہے، اور سود کا روپیہ لینا اتنی اتنی بار زنا کرنے سے سخت تر ہے یہ امر صحیح ہے یا نہیں؟

اعلیٰ حضرت نے جواباً ارشاد فرمایا بے شک صحیح ہے اور اس باب میں کثیر احادیث وارد ہیں اس کی تائید میں آپ نے ۲۸/ احادیث کریمہ پیش فرمائیں ان میں سے چند روایتیں یہ ہیں:

(۱) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: من أكل درهما من ربًا فهو مثل ثلث و ثلثين زنية و من نبت لحمه من سحت فالنار أولى به. ایک درہم سود کھانا تینتیس زنا کے برابر ہے اور جس کے گوشت کی بالیدگی حرام سے ہوئی تو نار جہنم اس کی زیادہ مستحق ہے۔

اس حدیث کو امام طبرانی نے معجم صغیر اور اوسط میں اور پہلا حصہ ابن عساکر نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے۔

(۲) نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "لدرهم يصيبه الرجل من الرجل أعظم عند الله من ثلاث و ثلثين زنية يزنيها في الإسلام" بے شک ایک درہم جو آدمی کو سود سے حاصل ہوتا ہے وہ اللہ کے نزدیک تینتیس زنا سے سخت تر ہے جو آدمی اسلام میں کرے۔

اس کو طبرانی نے معجم کبیر میں عبد اللہ بن مسعود اور عبد اللہ بن سلام رضی اللہ تعالے سے روایت کیا ہے۔

(۳) آقائے دوعالم علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا: ''درهم ربا يأكله الرجل وهو يعلم أشد عند الله من ستة وثلثين زنية'' سود کا ایک درہم جو آدمی دانستہ کھائے اللہ عزوجل کے نزدیک چھتیس زنا سے بڑھ کر ہے۔

اس کو امام احمد نے سند صحیح کے ساتھ اپنی مسند میں، طبرانی نے معجم کبیر میں حضرت عبد اللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔

(۴) تاج دار مدینہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: '' الربا سبعون حوبا أيسرها كالذى ينكح أمه وفى رواية سبعون بابا أدناها كالذي يقع على أمه'' سود ستر گناہ ہے ان میں سب سے آسان تر اس شخص کی طرح ہے جو اپنی ماں پر پڑے۔

اس کو ابن ماجہ نے اور ابن ابی الدنیا نے غیبت کی مذمت کے باب میں روایت کیا ہے، ابن جریر نے بھی روایت کیا ہے، ان کے علاوہ امام بیہقی نے سند حسن کے ساتھ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔

(۵) نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: ''إن الربا أبواب الباب منه عدل بسبعين حوباأدناها فجرة كاضطجاع الرجل مع أمه'' بے شک ربا کے کئی دروازے ہیں ان میں سے ایک دروازہ ستر گناہ کے برابر ہے جن میں سب سے ہلکا گناہ ایسا ہے جیسے اپنی ماں کے ساتھ ہم بستر ہونا۔

رواه ابن منده وأبو نعيم عن الأسود بن وهب بن عبد مناف بن زهرة الزهري القرشي خال النبى صلى الله تعالى عليه وسلم و رضى

الله تعالی عنه.[1]

﴿۲﴾

حقوقِ والدین پر درجنوں احادیث کا انبار اور فنی مباحث

فہم قرآن کے بعد فہم حدیث اور حفظ حدیث احکام فقہیہ کے استنباط کے لیے بے حد ضروری ہے اس تناظر میں اگر امام احمد رضا قدس سرہ کی ذات کو دیکھا جائے تو آپ اپنے عصر کے سند المحدثین نظر آتے ہیں، رجالِ حدیث کے احوال پر ان کی نظر اتنی عمیق تھی کہ جس راوی کے بارے میں جو الفاظ جرح و تعدیل ارشاد فرمادیتے، تقریب، تہذیب، تدریب اور میزان الاعتدال وغیرہ میں وہی الفاظ ملتے، مختصر یہ کہ اس فن کے جملہ گوشوں کو آپ کا علم محیط تھا، اور حفظ حدیث کا یہ عالم تھا کہ اپنے دعوی کے ثبوت میں درجنوں بلکہ بعض مقامات پر سو سو احادیث کریمہ سے برجستہ استدلال فرمایا ہے ساتھ ہی اس کی بھی صراحت فرمائی کہ اس حدیث کو فلاں فلاں محدثین نے فلاں صحابی سے فلاں کتاب میں ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے اور فلاں نے ان الفاظ کے ساتھ۔ اس کی چند جھلکیاں نذر قارئین ہیں ملاحظہ فرمائیں، نیز علم حدیث کے طالب علم پر یہ بات مخفی نہیں کہ تعدد صحابہ سے احادیث میں بھی تعدّد ہوتا ہے۔

صرف اس مسئلہ کے ثبوت میں کہ والدین کے اولاد پر کیا حقوق ہیں اور والدین کی نافرمانی کرنے والا کیسا ہے؟ لکھتے ہیں:

اولاد کو حقوق پدری کا خیال نہ کرنا اس کے ساتھ تمرد و مخالفت سے پیش آنا اپنے لیے عذاب شدید نار و غضب رب قہار واجب کرتا ہے، اللہ عزوجل نے قرآن عظیم میں فرض کیا کہ والدین کے ساتھ احسان کرو، انھیں اُف نہ کہو، ان سے اعزاز و اکرام کا کلام کرو، ان کے لیے خاص محبت سے تذلل کا بازو بچھاؤ۔ اھ۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

---

(۱) فتاوی رضویہ ج:۷،ص:۸۰-۸۱ ،باب الربا، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی

(۱) ثلثة لایدخلون الجنة العاق لوالدیه والدیوث والرجلة من النساء[1] رواه النسائی والبزار[2] باسنادین نظیفین والحاکم فی صحیحه المستدرك عن ابن عمر رضی الله تعالیٰ عنهما.

تین شخص ہیں کہ جنت میں نہ جائیں گے، ماں باپ کو ستانے والا، دیوث اور مردانی وضع بنانے والی عورت۔

(۲) نیز فرماتے ہیں ﷺ: ثلثة لا یقبل الله عزوجل منهم صرفاولاعدلا عاق ومنان ومکذب بقدر رواه ابن أبی عاصم في کتاب السنة بإسناد حسن عن أبی أمامة رضی الله تعالیٰ عنه.[3]

تین شخص ہیں کہ اللہ تعالیٰ نہ ان کے نفل قبول فرماتا ہے نہ فرض، والدین کو ایذا دینے والا، احسان جتانے والا اور تقدیر کو جھٹلانے والا۔

نیز حدیث میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

(۳) ملعون من عق والدیه ملعون من عق والدیه ملعون من عق والدیه رواه الطبرانی والحاکم عن أبی هریرة رضی الله تعالیٰ عنه.[4]

ملعون ہے وہ جو اپنے ماں باپ کو ستائے ملعون ہے وہ جو اپنے والدین کو ایذا دے، ملعون ہے وہ جو اپنے والدین کی نافرمانی کرے۔ اس حدیث کو امام طبرانی و امام حاکم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ (مترجم)

نیز حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

(۴) رضا الله فی رضا الوالد وسخط الله فی سخط الوالد،

---

(۱) سنن نسائي، كتاب الزكاة، نور محمد كتب خانه تجارت كتب كراچی ۱/ ۳۵۷.
(۲) كشف الأستار، عن زوائد البزار كتاب البرو الصلة، مطبع بيروت ج:۲/ ۳۷۲.
(۳) فتاوی رضویه، ج:۷، ص: ۳۹٤، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی
(۴) فتاوی رضویه، ج:۷، ص: ۳۹٤، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی

رواه الترمذي والحاكم بسند صحيح عن عبد الله بن عمرو والبزار عن عبد الله بن عمر رضى الله عنهما.[1]

اللہ کی رضا والد کی رضا میں ہے اور اللہ کی ناراضی والد کی ناراضی میں ہے۔

(۵) كل الذنوب يؤخرالله تعالیٰ منها ماشاء إلیٰ يوم القيمة إلا حقوق الوالدين فإن الله يعجله لصاحبه فی الحياة قبل الممات.

رواه الحاكم والأصبهانی والطبرانی فی الكبير عن أبی بكرة رضی الله عنه.

تمام گناہوں کی سزا اللہ تعالیٰ چاہے تو قیامت تک کے لیے اٹھا رکھتا ہے مگر ماں باپ کو ستانا کہ اس کی سزا مرنے سے پہلے زندگی میں دے دیتا ہے۔

مال کے لیے ماں باپ سے مخاصمت کتنی بے حیائی اور بے باکی ہے، رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

(۶) لاتعقن والديك وإن أمراك أن تخرج من أهلك ومالك.

رواه الإمام أحمد بسند صحيح على أصولنا والطبراني فی الكبير.

خبر دار ماں باپ کی نافرمانی نہ کرنا اگرچہ وہ تجھے اپنی بیوی، بچوں اور مال ومتاع سب سے نکل جانے کا حکم دیں، اس کو امام احمد نے ہمارے اصول پر صحیح سند کے ساتھ اور طبرانی نے کبیر میں روایت کیا ہے۔

دوسری روایت میں ہے:

اَطع والديك وإن أخرجاك من مالك ومن كل شيء هولك.

رواه الطبرانی فی الأوسط بسند صالح كلاهما عن معاذ بن جبل رضی الله تعالیٰ عنه.

اپنے ماں باپ کا حکم مان اگرچہ وہ تجھے تیرے مال اور تیری سب چیزوں سے

(۱) فتاوی رضویه، ج:۷،ص: ۳۹٤ ، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی

باہر کر دیں، اسے طبرانی نے معجم اوسط میں بسند صالح روایت کیا۔ یہ اوپر کی دونوں حدیثیں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہیں۔

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد اعلیٰ حضرت رقم طراز ہیں:

او ناشکر، خدا ناترس ! مال لایا کہاں سے، تیرا گوشت پوست استخوان سب تیرے ماں باپ کا ہے۔

(۷-۸-۹) أنت ومالك لأبيك (تو اور تیرا مال سب تیرے باپ کا) یہ اس وقت ارشاد ہوا کہ ایک صاحب حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ! مال و عیال رکھتا ہوں اور میرے ماں باپ میرا سب مال لینا چاہتے ہیں یعنی پھر میں اور میرے بال بچے کیا کھائیں گے، فرمایا: تو اور تیرا مال سب تیرے باپ کا ہے تجھے اس سے انکار نہیں پہنچتا۔

رواه ابن ماجه بسند صحيح عن جابر والطبراني فى الكبير عن سمرة بن جندب و عبد الله بن مسعود رضى الله تعالىٰ عنهم.(۱)

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد امام اہل سنت نے ایک طویل حدیث نقل فرمائی ہے جو تمام مسلمانوں کے لیے عبرت آموز اور ایمان افروز ہے اس پر اعلیٰ حضرت کا طرز بیان ایسا شستہ اور دل نشیں ہے کہ پڑھنے کے بعد قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

حدیث میں ہے ایک شخص حاضر خدمت ہو کر عرض گزار ہوئے:

إن أباه يريد أن يأخذ ماله.

یا رسول اللہ! میرے باپ میرا مال لینا چاہتے ہیں، حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اُدعه لی انھیں ہمارے حضور میں حاضر لاؤ، جب حاضر ہوئے ان سے ارشاد ہوا: تمھارا بیٹا کیا کہتا ہے؟ تم اس کا مال لینا چاہتے ہو، عرض کی حضور اس سے پوچھ کر دیکھیں کہ میں وہ مال لے کر کیا کرتا ہوں، یہی اس کی مہمانی اور قرابتی میں یا میرا اور

(۱) فتاوی رضویه ج:۷، ص:۳۹٤، بحواله سنن ابن ماجه ابواب التجارات ص:۱٦٧، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی

میرے بال بچوں کا خرچ، اتنے میں جبرئیل علیہ السلام حاضر ہوئے اور عرض کی: یارسول اللہ ﷺ اس مرد پیر نے اپنے دل میں کچھ اشعار تصنیف کیے ہیں جو ابھی خود اس کے کان نہیں سنے یعنی ہنوز زبان تک نہیں لایا، حضور پر نور ﷺ نے فرمایا: تم نے اپنے دل میں کچھ اشعار تصنیف کیے ہیں جو ابھی تمھارے کان نے بھی نہ سنے وہ سناؤ، ان صاحب نے عرض کی اللہ ہمیشہ حضور کے معجزات سے ہمارے دل کی نگاہ، ہمارا یقین بڑھاتا ہے، پھر یہ اشعار عرض کرنے لگے:

غذوتك مولودا ومُنْتك يافعا تُعَلُّ بما أجنى عليك و تُنْهَلُ
إذا ليلةٌ ضَاقَتْكَ بِالسُّقْمِ لم أبِتْ لِسُقْمِكَ إلّا سَاهِرًا أَتَمَلْمَلُ
تَخافُ الرَّدَىٰ نفسى عليكَ و إنها لَتَعلمُ أنَّ الموتَ حَتْمٌ مُؤَكَّل،
كأنى أنا المطروقُ دونَك بالذى طُرِقْتَ به دُوْنِى فَعَيْنِىَ تَهْمِلُ
فَلَمَّا بَلَغْتَ السِّنَّ والغايَةَ التى إليكَ مَدى ماكُنتُ فيك أُؤَمِّلُ
جعلتَ جزائى غِلْظَةً و فَظَاظَةً كأنّكَ أنتَ المُنْعِمُ المُتَفَضِّلُ
فَلَيتَكَ إذ لم تَرْعَ حقَّ أُبُوَّتِىْ فعلتَ كما الجارُالمجاوِرُ يَفْعَلُ
و أَوْلَيْتَنى حقّ الجوارِ ولم تَكُنْ عَلَىَّ بمالىْ دُوْنَ مالِكَ تَبْخَلُ

ترجمہ:

(۱) میں نے تجھے غذا پہنچائی جب سے تو پیدا ہوا اور تیرا بار اٹھایا جب سے تو ننھا ہوا، میری کمائی سے تو بار بار سیراب کیا جاتا۔

(۲) جب کوئی رات بیماری کا غم لے کر تجھ پر اترتی، میں تیری ناسازی کے باعث جاگ کر لوٹ کر صبح کرتا۔

(۳) میرا جی تیرے مرنے سے ڈرتا حالاں کہ اسے خوب معلوم تھا کہ موت یقینی ہے۔ اور سب پر مسلط کی گئی ہے۔

(۴) میری آنکھیں یوں اشک بار ہوتیں کہ گویا وہ مرض جو شب کو تجھے ہوا تھا نہ مجھے، مجھے ہوا تھا نہ تجھے۔

(۵) اور جب تو پروان چڑھا اور اس حد کو پہنچا جس میں مجھے امید لگی ہوئی تھی کہ اس عمر کا ہو کر تو مجھے کام آئے گا۔

(۶) پس تو نے میرا بدلہ سختی اور درشت خوئی سے دیا گویا تیرا ہی مجھ پر فضل و احسان ہے۔

(۷) اے کاش! جب تو نے حق پدری کا لحاظ نہ کیا تو ایسا ہی کرتا جیسا پاس کا ہمسایہ کرتا ہے۔

(۸) اور ہمسایہ کا حق تو مجھے دیا ہوتا اور مجھ پر اس مال سے بخل نہیں کرتا جو اصل میں تیرا نہیں میرا ہی تھا۔

ان اشعار کو استماع فرما کر حضور پر نور رحمت عالم ﷺ نے گریہ کیا اور بیٹے کا گریبان پکڑ کر ارشاد فرمایا:

إذهب أنت ومالك لأبيك. جا تو اور تیرا مال سب تیرے باپ کا ہے۔

رواه الطبرانی فی المعجم الصغیر والبیهقي في دلائل النبوة عن جابر بن عبد الله رضی الله تعالیٰ عنهما.[۱]

مذکورہ بالا احادیث طیبہ سے امام احمد رضا قادری قدس سرہ کے علوم حدیث میں تبحر کا اندازہ ہوتا ہے کہ حقوق والدین کو ثابت کرنے کے لیے انھوں نے درجنوں احادیث کے انبار لگا دیے اور وہ بھی اس انداز میں کہ ہر حدیث کے راویوں کے ساتھ ان کی تخریج بھی کر دی، اور یہ بھی بتا دیا کہ یہ حسن ہے یا صحیح اور یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جو طُرُقِ حدیث کے احوال سے مکمل واقفیت رکھتا ہو۔

(۱) فتاوی رضویه، ج:۷، ص:۳۹۵، مطبوعه رضا اکیڈمی، ممبئی.

(ب) المعجم الصغیر للطبرانی باب من اسمه محمد ترجمه حضرت جابر بن عبد الله رضی الله عنه ۲/ ۶۳.

(ج) دلائل النبوة للبیهقی باب ماجاء فی إخباره من قال فی نفسه شعرا، بیروت ۶/ ۳۰۴-۳۰۵.

تطفلات (سہو وخطا پر تنبیہات)

(۱)

صاحب تنویر الابصار پر تطفل

علامہ شامی نے رد المحتار میں متن کے اس مسئلہ پر کہ بیع منعقد ہونے کی شرط، مبیع کا مال متقوم ہونا ہے یہ تفریع ذکر کی، کہ ایک ٹکڑے روٹی کی بیع باطل ہے کہ جواز بیع کے لیے کم سے کم ایک پیسہ قیمت ہونا شرط ہے اھ۔

امام احمد رضا قدس سرہ نے علامہ شامی کے اس جزئیہ پر کلام فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اصل اس مسئلہ کی قِنْیَة سے ہے رد المحتار نے اسے بحر سے نقل کیا ہے اور بحر نے قنیہ سے اور صاحب بحر کے شاگرد علامہ غزّی تمر تاشی نے ان کی متابعت کی اور یہاں تک مبالغہ کیا کہ اس مسئلہ کو اپنے متن تنویر الابصار کی متفرقات البیوع میں کتاب الصرف سے کچھ پہلے داخل فرمایا حالاں کہ تنویر کی اصل دُرر وغرر اس سے خالی ہے اوراس کے شارح علامہ علاء الدین حصکفی نے اسے قنیہ ہی کی طرف پھیر دیا بلکہ خود مصنف نے اس کی شرح منح الغفار میں اس کا اعتراف فرمایا متن کی اس عبارت کے بعد فرمایا کہ اسے بھی قنیہ نے نقل کیا۔ انتہی۔ یعنی جیسے اس سے پہلا مسئلہ بھی قنیہ میں منقول ہے اور وہ یہ ہے کہ کبوتر کی بیٹ جو کثیر ہو اس کی بیع وہبہ صحیح ہے۔ اور قنیہ مشہور ہے کہ اس کی روایتیں ضعیف ہوا کرتی ہیں۔

علما نے تصریح فرمائی ہے کہ قنیہ جب مشہور کتابوں کی مخالفت کرے تو مقبول نہ ہوگی بلکہ نص فرمایا ہے کہ قنیہ اگر قواعد کی مخالفت کرے تو مقبول نہ ہوگی جب تک اس کی تائید میں کوئی اور نقل معتمد نہ پائی جائے اور اعتبار منقول عنہ کا ہوتا ہے ناقل کا نہیں، اور نقلوں کی کثرت سے مسئلہ کی غرابت دفع نہیں ہوتی جب کہ ایک ہی منقول عنہ ان سب کا منتہیٰ ہو۔

نقول کی کثرت سے مسئلہ کی غرابت دور نہیں ہوتی اس کو اعلیٰ حضرت نے ایک اور مثال سے سمجھایا ہے۔

ظہیریہ میں یہ حکم ہے کہ سجدۂ تلاوت کے بعد بھی قیام مستحب ہے جیسا کہ اس سے پہلے مستحب ہے، اس مسئلہ کو تاتار خانیہ، غنیہ، اور مضمرات نے نقل کیا اور ان سے بحر نے۔ اور در مختار وغیر میں اسی کو اختیار فرمایا ہے ان ساری نقول کے باوجود بحر میں یہ حکم فرمایا کہ وہ غریب ہے۔

علامہ شامی نے اس کی غرابت کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ تنہا ظہیریہ نے اس مسئلہ کو ذکر کیا ہے اور اسی وجہ سے بعد والوں نے فقط اس کی طرف اس کو منسوب کیا ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ قنیہ کے اس مسئلہ کو اتنی نقول بھی نصیب نہ ہوئیں اور نہ قنیہ ظہیریہ کی مثل ہے تو غرابت کہاں سے دفع ہوئی۔ (۱)

مزید ترقی کرتے ہوئے اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

اور کاش وہ مسئلہ صرف غریب ہی ہوتا تو حدیث شاذ کے مثل ہوتا مگر یہ تو حدیث منکر کے مثل ہے اس لیے کہ قنیہ نے اس مسئلہ میں دونوں مخالفتیں جمع کر لی ہیں۔ ایک تو کتب مشہورہ کی مخالفت اور دوسرے قواعد شرع کی مخالفت۔

کتب مشہورہ کی مخالفت اس طور پر ہوئی کہ فتح القدیر، شرنبلالی، طحطاوی اور ردالمحتار وغیرہا معتمد کتابوں میں فرمایا:

لو باع كاغذة بألف يجوز ولا يكره.اھ . اگر ایک کاغذ ہزار کو بیچا تو جائز ہے اور کراہت بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں بھلائی اور اس سے زیادہ جزا دے کہ انھوں نے کاغذ میں تاے وحدت بڑھادی (یعنی ایک کاغذ) لیکن یہاں تو ایک اور چیز نہایت عظیم و جلیل ہے اور وہ یہ کہ ہمارے تمام ائمہ نے ان روایات میں جو ان سے مشہور و متواتر ہیں اجماع فرمایا اور متون و شروح و فتاواے مذہب کا اس پر اتفاق ہے کہ ایک چھوہارا دو چھوہاروں کو اور ایک اخروٹ دو اخروٹوں کے عوض بیچنا جائز ہے، اور فتح

(۱) الفتاوى الرضوية، المجلد السابع ص: ١٤٠.

القدیر و در مختار میں یہ بھی زائد کیا کہ دو سوئیوں کے بدلے ایک سوئی اور ہر شخص جانتا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی ایک پیسہ کی نہیں ہوتی، ہمارے شہر میں معقول گنتی کے چھوہارے ایک پیسے کے ہوتے ہیں اور یہاں اور بھی سستے ہیں ایسے ہی اخروٹ اور یہ ہمارے شہروں میں زیادہ ارزاں ہیں اور ہندوستان میں ایک پیسہ کی آٹھ سے لے کر پچیس سوئیاں تک ملتی ہیں، تو اس مسئلہ قنیہ کی صریح مخالفت تمام کتب مشہورہ بلکہ نصوص جمیع ائمہ مذہب سے ہے۔

اور محقق علی الاطلاق (امام ابن الہمام) نے اگرچہ امام محمد سے امام معلی کی اس روایت کو ترجیح دی کہ دو چھوہارے کے بدلے ایک چھوہارا بیچنا مکروہ ہے مگر وہ کراہت ایک جانب زیادتی کے سبب ہے ایسا نہیں کہ چھوہارا ایک پیسہ کی قیمت کا نہیں ہوتا، آگے بھرپوری علمی جلالت کے ساتھ رقم طراز ہیں: ثم الرواية أيضا لا تقول إلا بالكراهة فأين البطلان وعدم الانعقاد الذى كنتم تدعون.[1]

پھر وہ روایت بھی تو اتنا ہی کہتی ہے کہ ایسی بیع مکروہ ہے، بیع باطل (اصلاً منعقد نہ ہونا) جس کا تمہیں دعوی تھا وہ کہاں گیا۔

علامہ شامی نے اپنی کتاب میں جو جزئیہ نقل فرمایا ہے اس پر اعلیٰ حضرت نے اس طور پر کلام فرمایا ہے کہ ردالمحتار نے اسے بحر سے اور بحر نے قنیہ سے نقل کیا، پھر علامہ غزی نے بحر کی متابعت میں اسے اپنے متن میں درج فرمایا حالاں کہ تنویر کی اصل دُرر و غُرر اس سے خالی ہے حاصل یہ کہ ان تمام نقول کا منتہی قنیہ ہی ہے اور قنیہ مشہور ہے کہ اس کی روایتیں ضعیف ہوا کرتی ہیں، پھر یہ کہ قنیہ مشہور کتابوں مثلاً: فتح القدیر شرنبلالی، طحطاوی، ردالمحتار وغیرہا کی مخالفت کر رہی ہے اسی طرح وہ قواعد شرع کی بھی مخالفت کر رہی ہے تو اگر قنیہ کی محض غرابت کا مسئلہ ہوتا تو حدیث شاذ کے مثل ہوتا یہ تو حدیث منکر کی طرح ہو گیا، ابھی دلیل عقلی سے قنیہ کے جزئیہ کا رد باقی ہے، ان دلائل سے اعلیٰ حضرت کی اعلیٰ فقہی بصیرت کے ساتھ نادر طرز استدلال کا بھی پتا چلتا ہے جو

---

(۱) الفتاوى الرضوية، المجلد السابع ص:۱٤۱ - ۱٤۲ ملخصا و ملتقطا.

انھیں کا حصہ ہے۔

﴿۲﴾

علامہ شامی پر تطفل

بیع وثمن میں ایسی جہالت جو تنازع کا سبب ہو بیع کو فاسد کر دیتی ہے۔

صحت بیع کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ بیع معلوم الثمن والمبیع ہو اس طور پر کہ نزاع سے مانع ہو لہٰذا بیع یا ثمن میں ایسی جہالت جو مفضی الی المنازعہ ہو بیع کو فاسد کر دیتی ہے، مثلاً بائع نے مشتری سے کہا "اس ریوڑ میں سے ایک بکری کی میں نے بیع کی، یہ بیع فاسد ہے" یا یہ کہا "اس چیز کی قیمت جتنی ہے اس کے ساتھ میں نے بیع کی" اسی طرح بائع نے کہا فلاں شخص جو اس کی قیمت لگا دے اسی ثمن پر میں نے اسے بیچ دیا، ان تینوں صورتوں میں بیع فاسد ہے پہلی صورت میں اس لیے کہ مبیع مجہول ہے اور دوسری تیسری میں اس لیے کہ ثمن مجہول ہے اور ان سب میں جہالت بھی ایسی ہے جو باعث نزاع ہو سکتی ہے۔

اب کسی نے اس طور پر بیع کی کہ ثمن مجہول ہے اور مشتری نے قبول بھی کر لیا تو حسب قاعدہ یہ بیع فاسد ہے لیکن اسی مجلس بیع میں قبل انقضائے مجلس مشتری کو ثمن کا علم ہو گیا تو کیا یہ بیع جواز کی طرف پلٹ آئے گی یا نہیں؟ اس تعلق سے علامہ شامی نے نہایہ اور فتح القدیر کی ایک روایت نقل فرمائی ہے۔

ردالمحتار میں ہے: "فی النهاية والفتح وغيرهما قال شمس الأئمة الحلواني: وإن علم بالرقم في المجلس لا ينقلب ذلك العقد جائزا ولكن إن كان البائع دائما على الرضا فرضي به المشترى ينعقد بينهما عقد بالتراضي اھ وعبر في الفتح بالتعاطى والمراد واحد.اھـ . اور لفظ فتح القدیر یہ ہیں: وجوازه إذا علم في المجلس بعقد آخر هو التعاطى كما قاله الحلوانى.اھـ.[1]

---

(1) الفتاوى الرضوية، المجلد السابع ص:٤٤

نہایہ و فتح القدیر وغیرہما میں ہے شمس الائمہ حلوانی نے فرمایا: اگر چہ قیمت کا علم مجلس بیع ہی میں ہوجائے وہ عقد جائز میں تبدیل نہ ہوگا، ہاں اگر بائع دائما رضا پر قائم ہو اور مشتری بھی اس سے راضی ہوجائے تو اب دونوں کے مابین تراضی کے سبب ایک دوسرا عقد منعقد ہوجائے گا، اور فتح القدیر میں اس کو تعاطی سے تعبیر کیا گیا اور مراد ایک ہے، اور فتح کے الفاظ یہ ہیں:

یہ بیع اس صورت میں جائز ہوگی جب کہ مجلس میں قیمت کا علم ہوجائے، ایک دوسرے عقد کی بنیاد پر جو بیع تعاطی ہے۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو شمس الائمہ حلوانی کے مذکورہ قول میں استبعاد نظر آیا اور ان کو سمجھ میں آیا کہ یہ دونوں دو روایتیں ہیں یعنی وإن علم بالرقم فی المجلس اور ولکن إن کان البائع دائما علی الرضا الخ، کیوں کہ پہلی عبارت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ عقد فاسد کے بعد تعاطی میں متارکہ یعنی فسخ بیع شرط ہے اور دوسری عبارت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ متارکہ شرط نہیں ہے۔

اب اس پر اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ کی دل پذیر اور عقدہ کشا تحریر ملاحظہ فرمائیں۔

فرماتے ہیں:

أقول: و هذا التعیین أن التعاطی بعد عقد فاسد إذا وقع فی المجلس لایحتاج الی سبقة متارکة ذلك الفاسد بخلافه بعد المجلس ألا تری إلی تقییده بقوله إذا علم فی المجلس وإلا فحصول البیع بعقد جدید لایتوقف کونه فی المجلس الأول فقد حصل التوفیق وان استبعده الشامی واستظهرأنهما روایتان أعنی اشتراط المتارکة فی التعاطي بعد الفاسد وعدمه فافهم وبالله التوفیق.اهـ .[1]

میں کہتا ہوں یہ قید (وان علم بالرقم فی المجلس) اس امر کو معین کرنے

(۱) الفتاوی الرضویة، المجلد السابع، ص:٤٤.

کے لیے ہے کہ تعاطی جب عقد فاسد کے بعد مجلس میں واقع ہو تو اس فاسد عقد کو پہلے فسخ کرنے کی ضرورت نہیں ہے ہاں اگر انقضاے مجلس کے بعد ہے تو فسخ کرنا ضروری ہے کیا نہیں دیکھتے کہ فتح نے اسے اپنے اس قول سے مقید کیا ''اذا علم فی المجلس'' ورنہ عقد جدید کے ساتھ بیع کا حصول اس بات پر موقوف نہیں کہ وہ مجلس اول میں ہو پس توفیق و تطبیق حاصل ہوگئی، اگرچہ شامی نے اس کو بعید خیال کیا اور یہ ظاہر فرمایا کہ یہ دونوں دو روایتیں ہیں۔

یعنی ان دونوں عبارتوں میں کوئی تعارض نہیں کیوں کہ علامہ شمس الائمہ حلوانی نے ''وإن علم بالرقم'' کی قید اس لیے لگائی ہے کہ مجلس میں قیمت معلوم ہونے کی صورت میں بیع تعاطی میں پہلے اس عقد کو فسخ کرنے کی ضرورت نہ پیش آئے اور یہی فتح القدیر سے بھی ثابت ہے انھوں نے ولکن ان کان البائع علی الرضا والی صورت کو اس شرط کے ساتھ مشروط فرمایا کہ جب مجلس میں قیمت معلوم ہو جائے جبھی اس صورت میں بغیر متارکہ کے بیع صحیح ہوگی ورنہ نہیں۔

ان توضیحات سے امام احمد رضا قدس سرہ کی عبارت فہمی، دقت نظری اور دقیقہ سنجی روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

علامہ شامی پر دوسرا تطفل

ابھی جو نہایہ اور فتح کی عبارت گزری اس کے بارے میں علامہ شامی فرماتے ہیں:

وجزم بخلافه فی الهندية آخر باب المرابحة و ذكرأن العلم في المجلس يجعل كابتداءالعقد ويصير كتاخير القبول إلى آخر المجلس. وبه جزم فی الفتح هناك أيضاً.(۱)

نہایہ اور فتح سے تو یہ معلوم ہوا تھا کہ اگر مجلس میں ثمن کا علم ہو گیا اور بائع و مشتری رضامندی پر قائم ہیں تو باہمی رضامندی کے سبب ایک دوسرا عقد منعقد ہو گیا

(۱) الفتاوی الرضوية، المجلد السابع، ص:٤٤.

اور وہ مشتری کا بیع کو اختیار کرلینا ہی عقد جدید ہے فسخ کی ضرورت نہیں، علامہ شامی فرماتے ہیں ہندیہ کے باب المرابحہ میں اس کے خلاف پر جزم کیا گیا ہے، اور وہ خلاف یہ ہے کہ ہندیہ میں یہ مذکور ہے:

"مجلس میں ثمن معلوم ہونے کو ابتداے عقد کے مانند قرار دیا جائے گا اور یہ آخر مجلس تک قبول کو مؤخر کرنے کی طرح ہوجائے گا"۔

اور فتح و نہایہ میں یہ کہا گیا تھا کہ یہ ابتداے عقد کے مانند نہیں بلکہ اس کا حکم حالت عقد والا ہے تو یہ ایسے ہی ہوگیا جیسے عقد کے وقت معلوم تھا، اب اعلیٰ حضرت علامہ شامی کے خلاف تین وجہوں سے کلام کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

أقول أولا: لقد أبعد الحجة فقد قال فی الهداية من باب خيار الشرط إنه أسقط المفسد قبل تقرره فيعود جائزا كما إذا باع بالرقم واعلمه فی المجلس. اهـ.

اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ نے ہدایہ، فتح القدیر اور بدائع الصنائع کے جزئیات سے یہ ثابت فرمایا کہ علامہ شامی دلیل سے دور ہوگئے، کیوں کہ ہدایہ باب خیار الشرط میں ہے، بائع نے مفسد کو فساد کے مستحکم ہونے سے قبل ساقط کردیا تو بیع جائز ہوگئی، جیسا کہ کسی نے لکھی ہوئی قیمت پر بیع کی اور مجلس کے اندر وہ قیمت مشتری کو بتادی۔

فتح میں کتاب البیوع کے شروع میں فرمایا جن چیزوں کے ساتھ بیع ناجائز ہے ان میں سے یہ ہے کہ کسی چیز کی بیع اس کی قیمت کے بدلے میں یا اس چیز کے بدلے میں جس سے بیع حلال ہو یا بائع مشتری کو یہ کہے کہ جتنی قیمت تو چاہے اس کے بدلے بیچتا ہوں یا یہ کہے جتنے پر اس نے خریدا ہے اس کے بدلے میں یا کہے جتنے پر فلاں نے خریدا اس کی مثل قیمت کے بدلے تو ان تمام صورتوں میں بیع ناجائز ہے، پھر اگر مشتری کو مجلس کے اندر قیمت کی مقدار معلوم ہوگئی اور وہ اس پر رضامند ہوا تو بیع جائز ہوجائے گی۔ الخ۔

وقال فی البدائع لوقال بعت هٰذا العبد بقيمته فالبيع فاسد

لأن قيمته تختلف باختلاف المقومين فكان الثمن مجهولا وكذا إذا باع بحكم المشترى أو بحكم فلان لأنه لا يدرى بماذا يحكم فلان وجهالة الثمن تمنع صحة البيع فإذا علم و رضى به جاز البيع لأن الجهالة قد زالت فى المجلس وله حكم حالة العقد فصار كأنه كان معلوما عند العقد وان لم يعلم به حتى افترقا تقررالفساد. اهـ مختصرا. (۱)

علم کلام میں مہارت

جنین مومن ہے اور اس کے ولی صرف اللہ عزوجل اور رسول اللہ ﷺ ہیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ فقہ کا تعلق عملیات سے ہے اور کلام کا تعلق اعتقادیات سے اور اعتقاد عمل پر مقدم ہے، بایں وجہ اس کی عظمت فقہ سے کسی طرح کم نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہے کہ اس میں باری تعالیٰ کی ذات وصفات پھر اس کے حبیب ﷺ کی ذات وصفات وغیرہا سے بحث ہوتی ہے۔

اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہمہ گیر شخصیت جس طرح میدان فقہ میں یکتائے روزگار تھی علم کلام میں بھی ان کا پایۂ علمی اتنا بلند ہے کہ ان کے عصر میں کوئی ان کا مماثل نظر نہیں آتا اگر اس جہت سے ان کی علمی سطوت کا جلوہ دیکھنا ہو تو ذیل کی تحریر ملاحظہ فرمائیں:

پیٹ کے بچے پر اللہ ورسول جل وعلا و ﷺ کے سوا کسی ولی، یا وصی یا حاکم یہاں تک کہ خود باپ کو بھی ولایت نہیں۔ ولوالجیہ پھر معین المفتی پھر غمز العیون میں القول فى الملك کے تحت ہے "لا ولاية للأب على

(۱) الفتاوى الرضويه: ۷/ ٤٤.

الجنین“ جنین پر باپ کو کوئی ولایت نہیں۔ غمز العیون میں معین المفتی سے منقول ہے:

وفی التبیین ولا تصح الھبة للحمل لأن الھبة من شرطھا القبول و القبض ولا یتصور ذلك من الجنین ولا یلی علیه أحد حتی یقبض عنه فصار کالبیع . تبیین میں ہے حمل کے لیے ہبہ کرنا صحیح نہیں اس لیے کہ ہبہ کی شرطوں سے قبول کرنا اور قبضہ کرنا ہے اور یہ جنین سے متصور نہیں اور نہ کوئی اور اس پر ولی ہے کہ اس کی طرف سے قبضہ کرے چناں چہ یہ بیع کی طرح ہو گیا عقود الدریه میں منح الغفار سے ہے:

لا ولایة للأب علی الجنین فضلا عن الوصی لقول الزیلعي ولا یلی علی الحمل باپ کو جنین پر کوئی ولایت نہیں چہ جائے کہ وصی کو حاصل ہو، زیلعی نے فرمایا: باپ کو حمل پر ولایت نہیں۔

مندرجہ بالا جزئیات میں یہ صراحت ہے کہ باپ، وصی اور نہ ان کے علاوہ کسی کو جنین پر کوئی ولایت ہے۔ بات تو صحیح ہے لیکن ایک سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو اس پر ولایت ہے یا نہیں تو اس کا جواب کسی نے بھی نہیں دیا جب اعلیٰ حضرت کی نگاہ ان جزئیات پر پڑی تو انھوں نے اس مسئلے کو اور بھی منقح فرما دیا اور اس سوال کا شافی جواب رقم فرمایا ذیل میں بعینہ وہ افادات ملاحظہ کریں:

اللہ جل جلالہ کا ولی و والی جملہ عالم ہونا ظاہر اور اس کی خلافت سے حضور پر نور سید عالم خلیفہ اعظم ﷺ کی ولایت بھی ہر شَے پر ہے اور خود جنین پر حضور اقدس ﷺ کی ولایت فقیر قرآن عظیم و حدیث صحیح سے ثابت کر سکتا ہے۔ آیت تو قول الٰہی عزوجل: اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِہِمْ (نبی مومنوں کی جان سے بھی زیادہ ان کے مالک ہیں) جس میں ارشاد ہوا کہ رسول اللہ ﷺ ہر مسلمان پر اس کی جان سے زیادہ ولی و اولی و مولی و مختار و صاحب تصرف و اقتدار ہیں اور شک نہیں کہ جنین انسان ہے۔

اور وہ یقیناً کافر نہیں۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

کل مولود یولد علی فطرۃ الإسلام. ہر پیدا ہونے والا فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ (۱)

اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتا ہے: فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا اللہ کی فطرت وہ ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا فرمایا۔

اہل سنت کے نزدیک ایمان و کفر میں کوئی واسطہ نہیں تو جنین ضرور مومن ہے اور بحکم آیت رسول اللہ ﷺ ہر مومن کے ولی و والی ہیں۔ یہ ثبوت آیت سے ہوا اور حدیث سے یہ کہ فقہائے کرام کی تصریحات سن چکے کہ جنین کا کوئی ولی نہیں اور رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: "اللہ ورسوله مولی من لا مولی له" جس کا کوئی ولی نہ ہو اس کا ولی و والی اور مولی اللہ و رسول ہیں جل و علا و ﷺ رواہ الترمذی و حسنه و ابن ماجه عن أمير المومنين الفاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ. (۲)

اگر غور کریں تو مذکورہ تحقیق سے اعلیٰ حضرت کی شان اجتہاد روز روشن کی طرح آشکار ہوتی ہے کہ اولاً قرآن حکیم سے جنین پر حضور ﷺ کی ولایت ثابت فرمائی اور جس آیت سے اس کا ثبوت فراہم کیا اس میں صراحۃً جنین کا کوئی ذکر نہیں ہے اور نہ اس کی طرف ذہن کا انتقال ہوتا ہے۔ آیت میں تو صرف مومن پر ولایت کا ذکر ہے پھر ایک مقدمہ کا سہارا لیا کہ بلا شبہہ جنین بھی انسان ہے اور جب انسان ہے تو یقینا کافر نہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے اور قرآن حکیم میں ہے اللہ کی فطرت وہ ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا فرمایا اب فطرت سے کون سی فطرت مراد ہے حدیث رسول نے اس کی شرح کر دی اور علمائے اہل سنت کے نزدیک علم کلام کا مسلم ضابطہ ہے کہ کفر و اسلام کے درمیان کوئی واسطہ نہیں۔ جب کافر

(۱) فتاوی رضویه، ۷/ ۵۴-۵۵ باب بیع الفضولی، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئ

(۲) فتاوی رضویه، ۷/ ۵۵، باب بیع الفضولی، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئ

ہونا منتفی ہو گیا تو مسلمان ہونا خود بہ خود ثابت ہو گیا لہٰذا جنین مومن ہوا اور ہر مومن پر نبی کو ولایت حاصل ہے۔

اسی طرح حدیث ترمذی و ابن ماجہ سے بھی آپ نے جنین پر اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی ولایت ثابت فرمائی۔ ان تصریحات سے جہاں آپ کی مجتہدانہ شان عیاں ہوتی ہے وہیں یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ کتنے بلند پایہ متکلّم تھے بلکہ آپ اپنے عصر میں امام المتکلّمین تھے۔

علم تاریخ میں مہارت

(۱)

امام بزدوی کی وفات ۴۸۲ھ میں ہوئی اور امام سرخسی کی ۵۰۰ھ یا ۴۹۰ھ میں

مفتی عبداللہ صاحب نے خانیہ کی اس عبارت سے جسے محقق علی الاطلاق نے فتح میں نقل فرمایا ہے: أجمعوا أنه إذا ارتشى لا ينفذ قضاءه فيما ارتشى فيه أحد، قلت: حكاية الإجماع منقوضة بما اختاره البزدوي واستحسنه فى الفتح الخ. یہ نتیجہ اخذ کیا کہ روایت نمبر ۸ سے بالخصوص یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ رشوت لے کر فیصلہ کیا ہوا باوجود بالاجماع باطل ہونے کے متاخرین نے اس لیے جائز اور نافذ مانا کہ ایسا نہ کرنے میں فیصلوں کا دروازہ ہی بند ہوا جاتا ہے کیوں کہ قاضی غیر مرتشی کا وجود ہی عنقا ہے۔

امام احمد رضا قدس سرہ نے ۳۰؍ تیس وجوہ سے مفتی مذکور کے فتویٰ کا رد فرمایا ہے۔ سولہویں رد میں جو انھوں نے تحریر فرمایا اس کا حاصل حسب ذیل ہے:

شانزدہم: یہ کہنا کہ رشوت لے کر کیے ہوئے فیصلے کو متقدمین نے باطل قرار دیا ہے اور متاخرین نے نافذ مانا ہے انتہائی غلط بات ہے اس لیے کہ باطل ہونے

کا قول امام شمس الائمہ سرخسی نے اختیار فرمایا ہے اور نفاذ کا قول امام فخر الاسلام بزدوی کا اختیار کردہ ہے جو ان کے معاصر بلکہ وفات میں ان سے مقدم ہیں۔ امام بزدوی کی وفات ۴۸۲ھ میں ہوئی اور امام سرخسی کی حدود ۵۰۰ھ یا حدود ۴۹۰ھ میں۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۲۵۲ھ میں وصال فرمایا

ہفدہم: یہ بھی غلط ہے کہ قائلین نفاذ نے نفاذ اس ضرورت سے مانا کہ سب حکام اب رشوت خور ہیں اور نہ مانیں تو فیصلے کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ یہ بات تو صرف علامہ شامی نے اپنے زمانے کی نسبت کہی ہے جو اسی تیرہویں صدی ہجری میں تھے۔ جن کے انتقال کو ابھی ۸۰/اسّی سال ہوئے ہیں، ۱۲۵۲ھ میں وصال فرمایا۔

ہیژدہم: یہ ضرورت امام فخر الاسلام کے زمانہ میں کیوں کر ہوئی حالاں کہ درمختار میں معروضات مفتی ابو سعود سے ہے:

لمّا وقع التساوی فی قضاة زماننا فی وجود العدالة ظاهرا ورد الأمر بتقديم الأفضل فی العلم والديانة والعدالة.

اس پر اسی ردالمحتار میں فرمایا:

هٰذا كان فی زمنه وقد وجد التساوی فی عدمها الآن فلينظر من يقدم.(۱)

جب ہمارے زمانے کے قاضیوں میں برابری واقع ہو گئی ظاہراً عدالت کے پائے جانے میں تو علم، دیانت اور عدالت میں جو افضل ہوں ان کو مقدم کرنے پر امر وارد ہوا علامہ شامی کہتے ہیں یہ ان کے زمانے کی بات تھی اور اب عدالت ظاہری نہ پائے جانے میں قضاۃ برابر ہو گئے تو دیکھنا چاہیے کس کو مقدم کیا جائے۔

اس پر اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

---

(۱) فتاوی رضویہ ۷/۵۰۸، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی

مفتی ابو سعود دسویں صدی ہجری کے آخر میں تھے ۹۸۲ھ میں وصال فرمایا

جب ان کے زمانہ تک تمام قاضی ظاہر العدالہ تھے تو زمانۂ امام اجل بزدوی میں کہ ان سے پورے ۵۰۰/ پانچ سو برس پہلے تھا سب رشوت خوار کیسے ہوئے۔ (۱)

ان عبارتوں سے پتا چلتا ہے کہ اعلیٰ حضرت جس طرح بالغ نظر فقیہ اور نکتہ سنج محقق تھے اسی طرح ایک عظیم تاریخ داں، بے مثال مؤرخ بھی تھے جبھی تو اس کی روشنی میں شرعی مسائل وقضایا کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

﴿۲﴾

فرعون اور قوم لوط میں دو ہزار برس کا فاصلہ تھا

اصول فقہ کا ضابطہ ہے کہ اگر ایک فعل میں لفظ واؤ کے ساتھ چند اسما کا ذکر ہو تو معیت مفہوم نہیں ہوتی مثلاً یہ کہا جائے جاء زید و عمرو اس میں معیت کا لفظ کہیں نہیں لفظ "اور" حرف "و" کا ترجمہ ہے جس سے نہ معیت مفہوم ہوتی ہے نہ ترتیب نہ تعقیب اور نہ تراخی۔ یہ صرف مجیئت میں اشتراک پر دلیل ہے جیسا کہ تمام کتب اصول میں اس کی صراحت ہے۔

اللہ عز وجل کا ارشاد ہے:

وَ جَآءَ فِرْعَوْنُ وَ مَنْ قَبْلَهٗ وَ الْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ﴿۹﴾

فرعون آیا اور اس سے پہلے والے اور گناہ کا ارتکاب کرنے والے۔

استدلال: ایک کلمۂ جاء میں سب کو جمع فرما دیا جب کہ فرعون اور قوم لوط میں ۲۰۰۰/ دو ہزار برس کا فاصلہ تھا علاوہ ازیں من قبلہ فرعون پر واؤ کے ساتھ معطوف ہے قبلیت و معیت کیوں کر جمع ہوں گی، لہٰذا ثابت ہوا کہ حرف واؤ کی دلالت فعل واحد میں ہر گز معیت پر نہیں ہوتی۔

(۲) فتاوی رضویہ ۷/۵۰۸، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی

مذکورہ بالا عبارات سے جہاں اصول فقہ میں اعلیٰ حضرت کے تبحر کا پتہ چلتا ہے وہیں علم تاریخ میں کامل رسوخ کا اندازہ ہوتا ہے اور اس تاریخ کے ذریعہ آپ نے اصول فقہ کے اس ضابطہ کو روشن تر فرمادیا۔ نیز مذہب حنفی کی تائید میں قرآن کریم کی آیت مذکورہ سے ایک اصول کے استنباط کی طرف اشارہ بھی فرمایا۔

مخالفین وموافقین پر تعاقبات

﴿۱﴾

نوٹ والے مسئلہ پر مولوی رشید احمد گنگوہی کا تعاقب

دیوبندیوں کے پیشوا مولوی رشید احمد گنگوہی سے جب نوٹ کی حقیقت اور اس کے احکام کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کرنسی نوٹ کو تمسک ٹھہرا کر سرے سے مال سے ہی خارج کر دیا اور کم وبیش تو در کنار برابری کے ساتھ بھی اس کی خرید وفروخت کو ناجائز قرار دیا چناں چہ اپنے فتاوی کی جلد دوم ص:۱۶۹ پر رقم طراز ہیں:

نوٹ وثیقہ اس روپے کا ہے جو خزانۂ حاکم میں داخل کیا گیا ہے مثل تمسک کے اس واسطے کہ نوٹ میں نقصان آجائے تو سرکار سے بدلا سکتے ہیں اور اگر گم ہو جائے تو بشرط ثبوت اس کا بدل لے سکتے ہین۔ اگر نوٹ مبیع ہوتا تو ہرگز مبادلہ نہیں ہو سکتا تھا۔ دنیا میں کوئی مبیع بھی ایسا ہے کہ بعد قبض مشتری کے اگر نقصان یا فنا ہو جائے تو بائع سے بدل لے سکیں، پس اس تقریر سے آپ کو واضح ہو جائے گا کہ نوٹ مثل فلوس کے نہیں ہے۔ فلوس مبیع اور نوٹ نقدین۔ ان میں زکات نہیں اگر بہ نیت تجارت نہ ہو اور نوٹ تمسک ہے اس پر زکات ہوگی۔ اکثر لوگوں کو شبہہ ہو رہا ہے کہ نوٹ کو مبیع سمجھ کر زکات نہیں دیتے۔ کاغذ کو مبیع سمجھ رہے ہیں اس میں

سخت غلطی ہے فقط۔[1]

گنگوہی صاحب نے اپنے فتاوی کی جلد اول ص:۵۷ و ۷۶ میں تحریر کیا:

نوٹ کی خرید و فروخت برابر قیمت پر بھی درست نہیں مگر اس میں حیلہ حوالہ ہو سکتا ہے اور بحیلہ عقد حوالہ کے جائز ہے مگر کم یا زیادہ پر بیع کرنا ربا و ناجائز ہے۔ یہ تفصیل اس کی ہے فقط۔[2]

یہاں تک گنگوہی صاحب کے فتوے کی عبارت تھی جس سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

(۱) نوٹ وثیقہ اور تمسک ہے کہ اگر اس میں نقصان آجائے تو سرکار سے بدلا سکتے ہیں۔

(۲) نوٹ مال نہیں اس لیے کہ وہ کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے اور کاغذ بھلا بکنے کی چیز ہے اس لیے نوٹ کو مبیع نہیں قرار دیا جاسکتا۔

(۳) نوٹ کی خرید و فروخت برابر قیمت پر بھی درست نہیں مگر حیلہ حوالہ کے ساتھ اور حیلہ حوالہ کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اس جلد دوم کے ص: ۱۷۳/ پر فرمانے والے تھے کہ روپیہ بھیجنے کی آسان ترکیب رجسٹری یا بیمہ کرا دینا ہے اب گھبرائے کہ نوٹ کی خرید و فروخت تو میں حرام کر چکا ہوں تو نوٹ آئیں گے کس گھر سے کہ رجسٹری کرا کر مرسل ہوں ناچار اِدھر اُدھر ٹٹولا حوالہ پر ہاتھ پڑا لہٰذا کہہ دیا بحیلہ عقد حوالہ جائز ہے۔

(۴) نوٹ کی بیع کمی یا زیادتی کے ساتھ سود ہے اور ناجائز۔

یہ چار امور ان کی عبارت سے منقح ہو کر سامنے آئے۔ اب مذکورہ دعوی کی شرعی حیثیت کیا ہے اگر اس کا جائزہ لینا ہو تو امام احمد رضا قدس سرہ کی وہ چشم کشا، فکر انگیز، تعاقبانہ تحریر پڑھیے جس میں انھوں نے دلائل قاہرہ باہرہ سے ان کے

---

(۱) فتاوی رشیدیہ ج:۲، ص:۱۶۹ بحوالہ فتاوی رضویہ، ۱۹۹/۷، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی

(۲) ایضاً، ۲۰۰/۷ (کاسر السفیه الواهم فی ابدال قرطاس الدراهم ۱۳۲۹ھ)

خرافات واباطیل کا پردہ چاک کر دیا ہے اور ۱۸/ اٹھارہ وجوہ سے ایسی سخت گرفت فرمائی کہ قیامت تک گنگوہی صاحب اور ان کے متبعین ان ردود کا جواب دینے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے۔ راقم سطور بہت ہی اختصار کے ساتھ ان ردود کا خلاصہ نذر قارئین کر رہا ہے:

رد اول: یہی سرے سے سخت حماقت ہے کہ دنیا بھر کے عاقدین جس عقد کا قصد کریں آپ زبردستی اس سے پھیر کر وہ عقد ان کے سر لازم کریں جو ان کے خواب وخیال میں بھی نہیں آتا۔ آپ دنیا کے جس خطے میں جس ملک میں چاہیں چلے جائیں اور لوگوں سے پوچھ لیں کہ نوٹ کی خرید وفروخت میں آپ کو لین دین مقصود ہوتی ہے، بیچا اور مول لیا کہتے ہیں، بائع اپنی ملک سے نوٹ کا خارج ہو کر مشتری کی ملک میں داخل ہونا اور مشتری اس کے عوض روپیہ دے کر نوٹ کا اپنی ملک میں آنا سمجھتا ہے یا یہ کہ نوٹ دینے والا اس سے قرض مانگتا ہے اور قرض کی سند میں نوٹ کی بجائے تمسک دیتا ہے۔ ہدایہ میں ہے: العبرة فی العقود للمعانی عقود میں معانی کا اعتبار ہے۔ مگر یہ عجیب ساعقد ہے کہ لفظ بھی بیچنے خریدنے کے، قصد بھی بیچنے اور خریدنے کا، یہی مقصود یہی مراد، یہی مفہوم، مگر دنیا بھر کو پاگل بنا کر کہہ دیجیے کہ اگرچہ نہ تم کہتے ہو نہ قصد رکھتے ہو مگر تمہاری مراد کچھ اور ہے اگر ایسی تصحیح ہو تو دنیا میں فاسد سے فاسد عقد ٹھیک ہو جائے گا۔

دوم: ہر عاقل جانتا ہے کہ تمسک ایک معین مثلاً زید کی طرف سے دوسرے معین مثلاً عمرو کے لیے ہوتا ہے کہ اگر زید عمرو کے دین کا انکار کرے تو عمرو بذریعہ تمسک زید سے وصول کر سکے۔ تمسک اس لیے نہیں ہوتا کہ عمرو جہاں چاہے جس ملک میں چاہے جس شخص سے چاہے اس کے دام وصول کر لے۔ زید کے پاس عمرو، بکر، خالد دنیا کا کوئی شخص اس تمسک کو لے کر آئے اور یہ اس کا دام اسے دے دے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوتا بلکہ تمسک ایک فرد معین کی طرف سے دوسرے فرد معین کے لیے وثیقہ اور قرارداد ہوتا ہے اور نوٹ کی حالت یہ ہے کہ جو

چاہے جہاں چاہے جس ملک میں چاہے بشرطے کہ یہاں کا سکہ اس ملک میں چلتا ہو جس شخص سے چاہے اس کے دام لے لے گا یہ حالت مال کی ہے نہ کہ تمسک کی۔ تو نوٹ کو تمسک کہنا کیسا اندھا پن ہے بلکہ وہ بالیقین مال اور سکہ ہے۔ ولکن العمیان لا یبصرون.

سوم: ہر عقل مند جانتا ہے کہ تمسک کے وجود و عدم پر دین کا وجود و عدم موقوف نہیں ہوتا بلکہ جب دین ثابت ہو جائے تو مدیون پر دین دینا لازم ہو گا تمسک رہے یا نہ رہے۔ اب فرض کیجیے کہ زید نے ایک لاکھ روپے دے کر خزانہ حاکم سے ہزار ہزار روپے کے سو نوٹ لیے اور اپنا نام پتا اور نوٹ کے نمبر سب درج کرا دیے تو اب لازم ہے کہ وہ جب چاہے خزانے سے اپنے آتے ہوئے لاکھ روپے وصول کر لے اگر چہ نوٹ اس کے پاس جل گئے یا پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئے یا چوری ہو گئے یا اس نے کسی اور کو دے دیے کیوں کہ خزانہ آپ کی نظر میں اس کا مدیون ہے اور تمسک نہ رہنے سے دین ساقط نہیں ہوتا اور جب آپ نے نوٹ کے نمبرات نام پتہ سب درج کرا دیے ہیں تو گورنمنٹ کو یہ اندیشہ نہیں ہو سکتا کہ اگر نوٹ نہ جلے نہ پھٹے بلکہ اس کے پاس موجود ہوں یا اس نے کسی کو دے دیے ہوں تو جب وہ نوٹ یہ یا دوسرا لے کر آئے تو ہمیں دوبارہ دینا پڑے گا بلکہ لانے کی صورت میں کہہ دیا جائے گا کہ ہم نے جو روپیہ تجھ سے لیا تھا قرض کے طور پر اسے ادا کر دیا ہے۔ آپ کا ہم پر کوئی مطالبہ نہیں مگر ایسا ہر گز نہ ہو گا۔ آپ نوٹ جلا کر یا پھاڑ کر یا کسی کو دے کر گورنمنٹ سے روپیہ مانگ کر تو دیکھیے۔ اگر پاگل جانا تو اتوار کو کھیر دے گی ورنہ بڑے گھر کی ہوا کھلائے گی اس وقت آپ کی آنکھیں کھلیں گی کہ نوٹ کیسا تمسک تھا۔ یہ حالت صراحۃً مال کی ہے کہ جو شخص کسی سے کوئی مال خرید کر اسے تلف کر دے یا کسی کو دے دے اور اپنے روپے بائع سے واپس مانگے تو کم از کم پاگل ٹھہرتا ہے۔

چہارم: یہیں سے آپ کے شبہے کا ازالہ ہو گیا کہ گم ہو جائے یا نقصان آجائے تو بدلا سکتے ہیں یہ مطلقاً ہر گز صحیح نہیں اگر تمسک ہوتا تو واجب تھا کہ ہر حال

میں ضرور بدل دیا جاتا کہ تمسک کے نقصان یا فقدان یا خود ہلاک یا تلف کر دینے سے دین پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔

پنجم: سود لینے اور دینے میں گورنمنٹ کی حالت معلوم ہے کہ وہ اسے ہر قرض و دین کا لازم قطعی مانے ہوئے ہے یعنی جس سے بھی گورنمنٹ قرض لیتی ہے یا دیتی ہے اسے وہ سود دیتی بھی ہے اور لیتی بھی ہے یہاں تک کہ جو لوگ سیونگ بنک (Saving Bank) میں روپیہ جمع کرتے ہیں یا وہ ملازم جن کی تنخواہ کا کچھ حصہ کٹ کر جمع ہوتا رہتا ہے اور ختم ملازمت پر ان کو دیا جاتا ہے وہ مانگیں یا نہ مانگیں ساری مدت کا سود حساب لگا کر انھیں دے دیتی ہے بلکہ اگر وہ یہ بھی کہہ دیں کہ سود نہ لوں گا جب بھی ماہوار سود اس کے نام سے درج ہوتا رہتا ہے۔ تو غور کریں اگر خزانہ سے نوٹ لینا یہ روپیہ داخل کر کے اس کا وثیقہ لینا ہوتا تو لازم تھا کہ گورنمنٹ اس کے لیے سود لکھتی رہتی جب تک وہ نوٹ دے کر روپیہ واپس نہ لے لیتا اس وقت تک۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہوتا۔

ششم: زید عمرو سے وقتاً فوقتاً سو اور دو سو اور ہزار قرض لیتا رہتا ہے اس تمام مدت میں وہ تمسکات لکھ کر عمرو کو دیتا رہے گا اور جس تمسک کی میعاد ختم ہونے کو آئے گی بدل دے گا یہاں تک کہ اس پر عمرو کے دس ہزار جمع ہو گئے اب اس نے ہزار ہزار کے دس نوٹ عمرو کو دے دیے اسی وقت سے اس کا حساب بند ہو جائے گا۔ مگر گنگوہی صاحب فرماتے ہیں دس ہزار کے نوٹ دیے تو کیا ہوا وصول ابھی ایک کوڑی بھی نہ ہوئی۔

ہفتم: فرض کیجیے گورنمنٹ نے کسی بینک سے ۲۰؍ لاکھ روپے قرض لیے اور تمسک لکھ دیا کہ دس برس کے اندر ادا کیا جائے گا تین برس گزرنے پر بیس لاکھ کے نوٹ بینک کو دے دیے تو پوری دنیا، بینک، گورنمنٹ سب تو یہی سمجھیں گے کہ قرض ادا ہو گیا مگر گنگوہی صاحب سے پوچھیے کہ اگر یہ نوٹ بھی تمسک ہی تھے تو اس فضول کاروائی کا حاصل کیا ہوا تمسک تو پہلے سے لکھا ہوا موجود تھا۔ جدید تمسک کی

ضرورت کیوں پڑی؟

ہشتم: حوالہ اپنا قرض دوسرے پر اتارنے کو کہتے ہیں تو اگر زید پر عمرو کا قرض نہ آتا ہو بلکہ زید کا قرض بکر پر ہو اور اس صورت میں زید عمرو کو بکر پر حوالہ کرے تو یہ حقیقۃً حوالہ نہ ہوگا بلکہ عمرو کو اپنا قرض بکر سے وصول کرنے کا وکیل کرنا اور اگر نہ عمرو کا قرض زید پر آتا ہو نہ زید کا بکر پر اور اس حالت میں زید عمرو کو بکر پر حوالہ کرے تو یہ محض باطل و بے اثر ہے۔

نہم: فرض کیجیے گورنمنٹ نے ۲۰ / لاکھ نوٹ کسی کو بطور انعام دیے تھے پھر ایک وقت ایسا آپڑا کہ گورنمنٹ نے اس سے قرض مانگا اس نے وہی نوٹ دے دیے۔ دنیا یہی سمجھے گی کہ گورنمنٹ پر اس کے ۲۰ لاکھ قرض ہو گئے مگر گنگوہی صاحب کہیں گے ایک پیسہ بھی قرض نہ ہوا گورنمنٹ بیس لاکھ کے نوٹ اس سے مفت لے لے اور اس کے عوض کچھ نہ دے اس لیے کہ یہ وہ صورت ہے کہ نہ حوالہ کرنے والے پر قرض آتا تھا نہ جس پر حوالہ کیا پہلے سے اس کا کوئی دین تھا تو کارروائی باطل ہوئی اور گورنمنٹ کو کچھ دینا نہ آئے گا۔ لا حول ولا قوة إلا بالله

غرض آپ نے یہ وہ بات گڑھی کہ نہ گورنمنٹ کے خواب میں ہے نہ ملک بھر کے خیال میں آپ ہی اپنی ڈیڑھ چھٹانک کی الگ بگھار رہے ہیں۔

دہم: پیسوں میں تجارت کی نیت کی حاجت اس وقت ہے جب وہ ثمن ہو کر نہ چلتے ہوں ورنہ ثمن میں ہر گز نیت تجارت کی حاجت نہیں اگرچہ ثمن اصطلاحی ہو نہ کہ خلقی۔ غنیۃ ذوی الاحکام ورد المحتار وغیرہا میں ہے

الفلوس إن كانت أثمانا رائجة أو سلعا للتجارة تجب الزكاة في قيمتها وإلّا فلا.

در مختار وبحر الرائق و نہر الفائق میں ہے: ما غلب غشه يقوم كالعروض ويشترط فيه النية إلا إذا كانت أثمانا رائجة.

شامی میں ہے: ما كان ثمنا رائجا تجب زكاته سواء نوى التجارة

أولا.

اسی میں ہے: عين النقدين لا يحتاج إلى قيمة التجارة وكذا ما كان ثمنا رائجا.

اسی پر فتوی ہے ایک آدھ روایت ٹٹول میں آجانا اور محل و محمل نہ دیکھنا راجح و مرجوح، شاذ و مشہور میں فرق نہ کرنا فقاہت نہیں مگر حضرات وہابیہ کے نصیبوں میں تو فقاہت بحمد اللہ نصیب دشمناں ہے۔

یازدہم: مذکورہ فتوے میں گنگوہی صاحب نے نوٹ کو نقدین بتایا ہے یعنی نوٹ سونا چاندی ہے اور پھر اسی منہ سے کہہ رہے ہیں کہ تمسک ہے۔ دونوں میں کتنا تضاد ہے۔

دوازدہم: تمسک کے بارے میں کہا کہ اس پر زکات ہے حالاں کہ ان کے نزدیک تمسک سرے سے مال ہی نہیں ہے تو کیا زکات غیر مال پر بھی واجب ہوتی ہے۔

سیزدہم: نوٹ کے مبیع سمجھنے پر اس کی زکات نہ دینے کی بنا سمجھنا۔ کیا مبیع پر زکات نہیں ہوتی۔ ابھی تو آپ پیسوں کو مبیع کہہ کر بحال نیت تجارت زکات واجب مان چکے ہیں۔

چہاردہم: گنگوہی صاحب نے کاغذ کے مبیع سمجھنے کو سخت غلطی کہا شاید عمر بھر کاغذ خریدنے کا اتفاق نہ ہوا ہو نہ ان کے گاؤں میں خبر پہنچی کہ دنیا میں کاغذ بھی بکتا ہے۔

پانزدہم: لطف کی بات یہ ہے کہ ابھی تو نوٹ کو اس جرم پر کہ کاغذ ہے مبیع سمجھنا سخت غلطی تھا اور ایک ہی ورق بعد ص: ۱۷۳ر پر خود فرماتے ہیں کہ نوٹ خرید کر بیچ سکتا ہے۔ اے سبحان اللہ نوٹ تو بک سکتا ہی نہ تھا خریدا کیسے جائے گا۔ مگر حضرت کی ان سفاہتوں کے آگے ایسی نزاکتوں کی کیا گنتی۔ ما على مثله

یعد الخطا.[1]

شانزدہم: آپ کیا جواب دیں گے اگر کوئی آپ کی پچھلی نزاکتوں پر یہ کہے کہ جب آپ نے اس عقد کو جو لفظ، نیت، قصد اور فہم کے اعتبار سے یقینی طور پر بیع تھا پوری دنیا کے خلاف کا یا پلٹ کر کے حوالہ تراش لیا اب آپ کس منہ سے کہتے ہیں کہ کم یا زیادہ پر بیع کرنا سود اور ناجائز ہے۔ زیادہ پر بیع کا یہ حاصل کیوں نہیں ٹھہراتے کہ زید نے جو عمرو کے ہاتھ سو روپے کا نوٹ سوا سو میں بیچا یہ بیع نہیں سوا سو کا سو سے بدلنا نہیں کہ ربا اور ناجائز ہو بلکہ زید نے عمرو سے سوا سو قرض لیے ہیں اور زید کے گورنمنٹ پر سوا سو آتے تھے وہ اس پر اتار دیے رہے پچیس وہ عمرو نے زید کو چھوڑ دیے اس میں کون سا ربا ہے۔

فتاوی امام قاضی خان سے رسالہ کے ص:۱۷۲ پر گزرا:

فإن أراد الحيلة يستقرض من المشتري اثنى عشر درهما مكسرة ثم يقضيه عشرة جيادا ثم أن المقرض يبرئه عن درهمين فيجوز ذلك.[2]

یہ وہ تعاقبات تھے جو کلک امام سے صادر ہو کر پیشوائے دیوبند پر برسے اور ان کی غایت درجہ سفاہت کا پردہ چاک ہوا، حق کا چہرہ نکھر گیا۔ امت مسلمہ کو حرج و عُسر میں ڈالنے کے لیے کتنا غلط فتوی انھوں نے صادر کیا جو عقل و شرع سے کوئی لگاؤ نہیں کھاتا۔

امام احمد رضا قدس سرہ نے جو بلا شبہہ مجدد اعظم ہی تھے بیس وجہوں سے ان کے مذکورہ استدلالات کا رد بلیغ فرمایا۔ میں نے ان میں سے صرف سولہ وجہوں

---

(۱) فتاوی رضویہ، ۲۰۶/۷، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی

(۲) فتاوی رضویہ ہفتم، ص:۲۰۶ (رسالہ :كاسر السفيه الواهم في ابدال قرطاس الدراهم) ، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی

کا یہاں ذکر کیا، باقی میں تفصیل زیادہ تھی اس لیے چار وجہوں کو ترک کر دیا۔ الحمد للہ بیان کردہ ردود سے یہ واضح ہو گیا کہ امام احمد رضا قدس سرہ کا علم کتنا راسخ تھا۔ کتنا وسیع مطالعہ تھا، خدائے عز و جل نے بصارت کے ساتھ غایت درجہ بصیرت سے بھی نوازا تھا۔

﴿۲﴾

تعاقبات بر مولانا لکھنوی

"تہذیب الایمان میں ہے" اس پر اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں قولہ: مولوی صاحب عجب ہے کہ آپ جیسا محقق جو اتنے علمی پایے پر ہو کہ ائمہ مجتہدین کی جانچ پڑتال کرے ان کا حق و باطل نکالے وہ مسائل شرعیہ کے لیے سند لانے میں ایسا گرے کہ مجاہیل و بے قدر و بے وقعت زید و عمرو سب سے استناد کرے۔ کہیں آپ مجالس الابرار سے سند لاتے ہیں کہیں رسالہ اسلمی سے کہیں اور اتر کر اربعین میاں اسحٰق دہلوی سے کہیں اور گھٹ کر ان کے کسی شاگرد کی عمدۃ التحریر سے کہیں سب سے بدتر صراط مستقیم اسماعیل دہلوی سے ان ہی مجاہیل میں یہ آپ کی تہذیب الایمان ہوگی جس پر بعض اصحاب نے کہا کہ آج تک تہذیب المنطق، تہذیب الکلام، تہذیب الاخلاق، تہذیب الآثار اور تہذیب النفوس تھی۔ معلوم نہیں ان بزرگ کو ایمان میں کیا بے تہذیبی سوجھی کہ اس کی تہذیب لکھی آپ استناد کرتے وقت جب ایسوں کی تقلید تک اتر آتے ہیں تو مسئلۂ نوٹ میں حضرت مولانا مولوی محمد ارشاد حسین صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا فتوی آپ کے سامنے تھا اور وہ آپ کے ان اکثر مستندین سے ہر طرح اعلیٰ و اعلم و افضل و اکمل تھے کاش اس میں ان کی تقلید فرماتے تو جھگڑا اچکتا۔(۱)

مولانا لکھنوی صاحب ایک مقام پر لکھتے ہیں:

اسی وجہ سے کتب فقہ میں بیع عینہ اور شرا بِأقلَّ مما باع وغیر ذلك کی

(۱) فتاوی رضویہ ج:۷، ص:۲۲۱، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی

ممانعت مذکور ہے۔

اس پر امام احمد رضا قدس سرہٗ اس طرح رقم طراز ہیں:

اقول اولاً: الحمد للہ اب تو آپ کنارے پر آیا چاہتے ہیں جی ہاں یہ بیع عینہ کے مثل ہے پھر بیع عینہ کو ہمارے ائمہ کرام نے کیا ٹھہرایا ہے کیا ممنوع، ناجائز، حرام، مکروہ تحریمی، حاشا ہرگز نہیں یہ محض غلط و باطل ہے بلکہ جائز، حلال، روا، درست ہے۔ غایت درجہ اس میں اختلاف ہوا کہ خلاف اولیٰ بھی ہے یا نہیں۔ ہمارے امام ابو یوسف خود ثواب و مستحب جانتے ہیں۔ امام محمد احتیاط کے لیے صرف خلاف اولیٰ ٹھہراتے ہیں۔ یہ تمام مباحث رسالہ میں ص:۱۶۹-تا-۱۸۰ بلکہ ۱۶۴-تا-۱۶۶ میں گزرے۔ اب تو اپنے ہی اقرار پر قائم رہ کر بول اٹھیے کہ سو کا نوٹ دو سو کا بیچنا امام اعظم کے نزدیک جائز و مباح، امام ابو یوسف کے نزدیک اجر و ثواب، امام محمد کے نزدیک صرف خلاف اولیٰ۔

ثانیاً: وہ خلاف اولیٰ بھی اس لیے تھا کہ اس وقت تک مسلمان سود کو سور سمجھتے تھے، اس کے سایہ سے بھاگتے تھے تو اس امر جائز کی عادت ڈالنے سے اندیشہ تھا کہ مبادا آگے بڑھ جائیں جیسا کہ اس کا بیان ص:۱۶۹، اور ۱۷۰ و ۱۷۱ پر گزرا اب کہ علانیہ سود مسلمانوں میں رائج ہو گیا تو انھیں ایک جائز بات بتانا جس سے ان کا مقصود حاصل ہو اور اللہ واحد قہار کے عذاب سے بچیں عین خیر خواہیِ مسلمین ہے اور اس میں ناحق کے شاخسانے نکالنا صریح بد خواہی ذرا انصاف درکار ہے۔ (۱)

یہ تھی امام احمد رضا قدس سرہ کی دقت نظر کہ جہاں تک آپ عقل و معرفت کی نگاہ سے دیکھ لیتے تھے آپ کے معاصرین و اکابر کی نگاہیں وہاں تک پہنچنے سے قاصر رہتیں۔

مولانا عبد الحی لکھنوی فرنگی محلی (جنھوں نے مؤطا امام محمد کا حاشیہ

---

(۲) ایضاً، ص:۲۲۳

"التعلیق الممجد" کے نام سے لکھا ہے) نے فتوی دیا تھا کہ نوٹ کو اس سے کم یا زیادہ روپے کے بدلے نہیں بیچا جا سکتا۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے گیارہویں سوال کے جواب میں پندرہ وجوہ سے ان کا رد فرمایا حالاں کہ اس وقت آپ کے پیش نظر وہ فتوی بھی نہیں تھا بلکہ اس کو آپ نے بہت پہلے ملاحظہ فرمایا تھا اور جب واپسی کے بعد ان کے فتوی کی طرف متوجہ ہوئے تو بیس وجوہ سے اس پر کلام فرمایا، جن میں سے کچھ وجوہ ہم ماسبق میں بیان کر آئے، زیر عنوان: غیر منصوص احکام کا استنباط اور جدید مسائل کی تحقیق۔ مزید کے لیے کتاب کی مراجعت مناسب ہوگی۔

امام احمد رضا بریلوی کو دیگر علوم وفنون میں جس درجہ کمال حاصل تھا اس کا اندازہ لگانا تو بہت مشکل ہے مگر علم لغت میں آپ کو جو امتیاز حاصل ہے وہ بھی باعث حیرت ہے۔ ضمناً اس کا بھی ایک نمونہ یہاں ملاحظہ کریں:

مولانا عبد الحی لکھنوی صاحب کی عادت یہ تھی کہ ہر جواب سے پہلے هوالمصوب لکھ دیا کرتے تھے۔ **اعلیٰ حضرت نے اس پر گرفت فرمائی اور ارشاد فرمایا:**

مولوی عبد الحی صاحب کے فتاوی کی دوسری جلد فتوی نمبر :۲۶ پر جواب سے پہلے هوالمصوب لکھا ہوا ہے اور ان کی یہ عادت بھی ہے حالاں کہ **اولاً:** اللہ عزوجل پر اس نام کا اطلاق وارد نہیں۔ **ثانیاً:** لغوی معنی بھی اس کی موافقت نہیں کرتے کیوں کہ لغت میں مصوب وہ ہے جو دوسرے کی بات ٹھیک بتائے یہ معنی نہیں کہ جو دوسرے کی بات کو ٹھیک بنائے یعنی اسے توفیق صواب بخشے۔ اس لیے کہ تصویب کا ثبوت وقوعِ قول کے بعد ہوتا ہے اور توفیق کا وقوع قول سے مقدم ہوتا ہے۔ **ثالثاً:** اس کے معنی اور بھی ہیں کہ باری عزوجل پر محال ہیں کیوں کہ مصوّب وہ ہے جو سر جھکائے ہو۔ مصوّب وہ سوار ہے جو گھوڑا تیز چلائے۔

قاموس میں ہے: صوبه قال له أصبت وراسه خفضه، تاج العروس میں ہے: صوبت الفرس إذا أرسلته فی الجری، میں نے گھوڑے کو تیز چلایا۔ہاں مصوب وہ بھی ہے جو دوسرے کا سر نیچا کرے یا بلندی سے پستی میں اتارے۔ تاج العروس میں ہے: التصویب خلاف التصعید و من قطع سدرة صوب الله راسه فی النار أی نکسه. (۱)

﴿۳﴾

مفتی عبد اللہ صاحب کے فتوے پر اعلیٰ حضرت قدس سرہ کا تعاقب

جمہور فقہاے مذاہب اربعہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ غیر مسلم جج کبھی بھی مسلمانوں کا قاضیِ شرع یا قاضی شرع کی منزل میں نہیں ہو سکتا اگر چہ اس کے فیصلے شریعت محمدی مصطفوی ﷺ کے موافق ہوں خواہ وہ ہندوستان کی سر زمین ہو یا دنیا کا کوئی اور خطہ ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ قضا کے لیے اہلیت ولایت شرط ہے اور کافر ادنیٰ سی ولایت جو شہادت ہے اس کا بھی اہل نہیں اس لیے کہ مسلمان پر کافر کی کوئی شہادت مقبول نہیں قرآن حکیم میں ارشاد ہے: وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾ (النساء، آیت:۱۴۱) اور ہر گز اللہ مومنوں پر کافروں کو کوئی راہ نہ دے گا۔

جب کفار شہادت کے اہل نہیں جو سب سے چھوٹی ولایت ہے تو منصب قضا جو اس سے بڑی ولایت ہے اس کے اہل بدرجہ اولیٰ نہیں ہو سکتے۔

اعلیٰ حضرت کے زمانے میں مفتی عبد اللہ صاحب سے ایک فتوی پوچھا گیا:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماے حنفیہ اس بات میں کہ ہندوستان میں جج عدالت دیوانی کا جو انگریز ہو شرع محمدی کے بموجب قاضی ہے یا نہیں؟

الجواب: حنفی مذہب کی رو سے ملک ہندوستان کی موجودہ حالت میں دیوانی

---

(۱) فتاوی رضویه، ج:هفتم، ص:۲۰۷، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی

عدالت کا جج غیر مسلم بمنزلہ شرعی قاضی کے ہے۔ اور اس کے فیصلے اسی طرح شرعا قابل نفاذ ہوں گے جس طرح ایک مسلمان قاضی کے ہو سکتے ہیں بشرطے کہ وہ فیصلے مذہب اسلام کے مطابق اور شریعت محمدی کے موافق ہوں۔ (۱)

مذکورہ بالا اقتباس سے دو باتیں ثابت ہوئیں ایک یہ کہ غیر مسلم جج حنفی مذہب کی روسے قاضیِ شرع کی منزل میں ہے دوسری یہ کہ اس کے فیصلے مسلمان قاضی کی طرح شرعا قابل نفاذ ہیں اس شرط کے ساتھ کہ وہ ہماری شریعت کے مطابق ہوں۔

اس فتوی کے متعلق اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے استفتا کیا گیا کہ حضور اس کے بارے میں آپ کی کیا راے ہے؟ کیا واقعی غیر مسلم مسلمانوں کا قاضی ہو سکتا ہے؟ جیسا کہ مفتی عبد اللہ صاحب نے تحریر کیا ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ نے اس فتوے کا ایسا علمی رد فرمایا اور ان کے پیش کردہ دلائل کا ایسا ناقدانہ تجزیہ فرمایا کہ مفتی موصوف کے قیاس فاسد اور اجتہاد باطل کی ساری قلعی کھل گئی۔

قبل اس کے کہ ہم اعلیٰ حضرت کا وہ علمی تعاقب پیش کریں مفتی موصوف کے دلائل کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

مفتی صاحب نے اس جواب میں قیاس و اجتہاد سے کام لیا ہے اور اس کا مدار چند امور پر رکھا ہے پہلا امر یہ ہے کہ کتب فقہیہ حنفیہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی کا منصبی فرض یہ ہے کہ حق دار کی حق رسی کرے اور مظلوم سے ظلم کو دفع کرے جس کے لیے اسے نہ عالم ہونے کی ضرورت ہے نہ مفتی متقی بلکہ اگر خود عالم ہے تو خیر ورنہ دوسرے عالم سے فتوی پوچھ کر جواب دے جیسا کہ صاحب ہدایہ علامہ برہان الدین فرماتے ہیں:

---

(۱) فتاوی رضویہ، ۷/۴۸۹، الهبة الاحمدیه فی الولایة الشرعیه والعرفیه، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئ

فالصحيح أن أهلية الاجتهاد شرط الأولوية فأما تقليد الجاهل فصحيح عندنا خلافا للشافعي رحمه الله وهو يقول: إن الأمر بالقضاء يستدعى القدرة عليه ولا قدرة دون العلم ولنا أنه يمكن أن يقضى بفتوى غيره ومقصودالقضاءيحصل به وهوإيصال الحق إلى مستحقه. هدايه.

دوسرا امر یہ ہے کہ فقہاے کرام نے قاضی کے لیے علم اور اتقا کی شرط اس لیے نہیں لگائی کہ ایسے قاضی کا ملنا جو عالم ہونے کے ساتھ متقی بھی ہو مشکل اور سخت مشکل ہے، لہٰذا اگر کسی جاہل بلکہ فاسق کو بھی قاضی بنادیا گیا تو قاضی بنانا صحیح ہے اور اس کا فیصلہ بھی صحیح ہے اگر کسی عالم سے پوچھ کر فتوی دے۔

محقق علی الاطلاق شیخ ابن الہمام فرماتے ہیں:

وقداختلف فى قضاءالفاسق فأكثرالأئمة على أنه لاتصح ولايته كالشافعى وغيره كما لا تقبل شهادته وعن علمائنا الثلثة فى النوادر مثله لكن الغزالى قال اجتماع هذه الشروط من العدالة والاجتهاد وغيرهما متعذر فى عصرنا لخلو العصر عن المجتهد والعدل فالوجه تنفيذقضاء كل من ولاه سلطان ذو شوكة وإن كان جاهلا فاسقا وهو ظاهرالمذهب عندنا فلو قلدالجاهل الفاسق صح ويحكم بفتوى غيره.

فتاوی عالم گیری میں ہے:

ويكون من اهل الاجتهاد والصحيح أن أهلية الاجتهاد شرط الأولوية كذا فى الهداية حتى لو قلد الجاهل وقضىٰ هٰذاالجاهل بفتوى غيره يجوز كذا فى الملتقط، ج:۳،ص:۳۰۷

اور قاضی مجتہد ہو، صحیح یہ ہے کہ مجتہد ہونا اولویت کی شرط ہے ایسا ہی ہدایہ میں ہے یہاں تک کہ اگر کوئی جاہل قاضی بنایا گیا اور اس نے دوسرے کے فتوے پر

فیصلہ کر دیا جائز ہے ایسا ہی ملتقط میں ہے۔

عبد الرحمٰن آفندی مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر میں تحریر فرماتے ہیں:

وفى الشمنى اجتماع هذه الشرائط من الاجتهاد والعدالة وغيرهما متعذر فى عصرنا لخلو العصر عن المجتهد والعدل فالوجه تنفيذ قضاء كل من ولاه سلطان ذوشوكة وإن كان جاهلا فاسقاً.اهـ.

اور ثالث یہ ہے کہ قضا کا منصب اور اس کے اختیارات دینے کے لیے دینے والے بادشاہ یا حاکم کا مسلمان ہونا ضروری نہیں نیز غیر مسلم میں قاضی ہونے کی صلاحیت موجود ہے اگر چہ مسلمانوں پر اس کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔

شیخ الاسلام علامہ علاؤالدین حصکفی در مختار میں فرماتے ہیں:

ويجوز تقليد القضاءمن السلطان العادل والجائر ولو كافرا ذكره مسكين وغيره إلا إذا كان يمنعه عن القضاءبالحق فيحرم. [1]

اور سلطان خواہ عادل ہو یا ظالم حتی کہ کافر اس کی طرف سے قضا کی تقرری جائز و درست ہے اس کو مسکین وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ مگر جب یہ اس کو حق کے ساتھ فیصلہ کرنے سے روک دے تو حرام ہو گا۔

علامہ شامی رد المحتار میں ولوکافرا کے تحت رقم طراز ہیں:

قوله ولو كافرا فى التتارخانية الإسلام ليس بشرط فيه أى فى السلطان الذى يقلد. تاتار خانیہ میں ہے وہ بادشاہ جو کسی کو قاضی مقرر کرے اس کا مسلمان ہونا شرط نہیں ہے۔ [2]

نیز علامہ شامی بحر کے حوالے سے یہ تحریر فرماتے ہیں:

(۱) فتاوی رضویہ، ۷/ ۴۹۱، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی
(۱) مرجع سابق، ۷/ ۴۹۱، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی

قال فی البحر و به علم أن تقلید الکافرصحیح وإن لم یصح قضاؤه علی المسلم حال کفره.اھ.

علامہ ابن نجیم حنفی نے فرمایا: اور اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ کافر کا قاضی مقرر کرنا صحیح ہے اگر چہ اس کی قضا کفر کی حالت میں مسلمان پر صحیح نہیں۔[۱]

یہ تھے وہ امور جن کو مفتی عبد اللہ صاحب نے اپنے اجتہاد کے لیے بطور مقدمات نقل کیا ہے اور فقہاے کرام کی عبارات سے نتیجہ اخذ کرنے میں مجتہدانہ روش اپنائی ہے ملاحظہ فرمائیں:

جب روایات مندرجہ بالا سے معلوم ہو گیا کہ قاضی کے لیے علم اور پرہیز گاری کی شرط کو فقہاے متاخرین نے اس لیے چھوڑ دیا ہے کہ اس کے ماننے سے فیصلوں کا دروازہ بند ہو جائے گا تو ظاہر ہے کہ ملک ہندوستان میں اسلام کی شرط ماننے سے بھی فیصلوں کا دروازہ بند ہو جائے گا اور مسلمانوں کے لیے یا کم از کم اسی جگہ کے مسلمانوں کے لیے جہاں کا قاضی (جج) مسلمان نہ ہو حق رسی کی کوئی صورت نہیں رہے گی کیوں کہ گورنمنٹ کو تمام اہل مذاہب سے یکساں تعلق ہے اس لیے مسلمان قاضی مقرر کرنے کی پابند نہیں ہو سکتی تو جس جگہ کا قاضی مسلمان نہ ہو گا وہاں یہ مشکل ضرور پیدا ہو گی اور اس میں کچھ شک نہیں کہ حق دار کی حق رسی کی طاقت اور اس کا عمل میں لانا جو منصب قضا کا اصل مقصود ہے جس طرح ایک مسلمان سے باوجود عالم پرہیز گار ہونے کے ممکن ہے اسی طرح ایک غیر مسلم قاضی سے بھی ممکن ہے الیٰ آخرہ۔[۲]

اس تحریر میں انھوں نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ جس طرح قاضی میں علم اور تقوی کی شرط لگانے سے فیصلوں کا دروازہ بند ہوتا ہوا نظر آتا ہے یوں ہی ہندوستان میں اسلام کی شرط ماننے سے بھی فیصلوں کا دروازہ بند ہو جائے گا حالاں کہ جو دلائل

(۲) فتاوی رضویہ، ۷/ ۴۹۰، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی
(۳) فتاوی رضویہ، ۷/ ۴۹۱-۴۹۲، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی

انھوں نے پیش کیے ہیں ان میں کہیں اس کی صراحت نہیں کہ کافر مسلمانوں کا قاضی ہو سکتا ہے یہ تو صرف مفتی صاحب کا اجتہاد ہے۔

اس فتوے پر نقد و نظر:

اب حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہ کی وہ تحقیق ملاحظہ فرمائیں جس میں آپ نے ان کے قیاس کی خوب خبر لی ہے۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

مولانا! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔ فقیر ان فتووں کی نسبت اس سے بہتر کیا کہہ سکتا ہے جو حضور اقدس ﷺ نے حدیث إذا وسد الأمر میں ارشاد فرمایا رواہ البخاری عن أبی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ یہ فتوے محض اجتہاد پر مبنی ہیں اور اجتہاد بھی وہ جو آج تک ابو حنیفہ و شافعی درکنار ابو بکر صدیق و عمر فاروق کو بھی میسر نہ ہوا نہ ہو سکتا تھا □ یعنی نص قطعی قرآن عظیم کے مقابل محض بے اصل و محض جامع قیاس بے اساس۔ اھ۔[1]

تحقیق حق کے لیے اعلیٰ حضرت نے بطور تمہید چھ مقدمات ذکر فرمائے:

ان میں (۱) پہلا مقدمہ ولایت اجباری کی حقیقت اور اس کی اقسام پر مشتمل ہے۔

(۲) مقدمہ دوم میں ولایت مجبرہ (اجباریہ) کی دونوں قسموں عرفیہ دنیویہ اور شرعیہ دینیہ کے درمیان مناشی و نتائج، لوازم و مقاصد کے اعتبار سے کیا فرق ہے اس کو بہت ہی واضح انداز میں بیان فرمایا ہے۔

(۳) مقدمہ سوم اس بیان میں ہے کہ ہر سلطنت خواہ وہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی اس کو اپنے ملک پر جو ولایت ہوتی ہے عرفیہ دنیویہ والی ولایت حاصل ہوتی ہے۔

---

(۱) ۷/ ۴۹۲، مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی.

(۴) مقدمہ چہارم میں اس کا بیان ہے کہ شریعت مطہرہ اسلامیہ نے ولایت عرفیہ کو جس سے آدمی والی ملک اور حاکم یا بادشاہ وقت ہو جاتا ہے اور رعایا کو اس کی پابندی لازم ہوتی ہے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ اس ولایت کو اللہ عزوجل نے مسلم یا غیر مسلم کے ساتھ خاص نہیں فرمایا ہے۔

(۵) مقدمہ پنجم میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مقصود کبھی وجود شَے ہوتا ہے یعنی شَے غیر موجود موجود ہو جائے اور کبھی حکم شرعی کا پیدا ہونا۔ اور قاضی کے ہاں جو مقدمات پیش ہوتے ہیں وہ دونوں قسم کے ہوتے ہیں۔ اب قسم اول میں ولایت کی تنفیذ یا عدم تنفیذ کس معنی کے اعتبار سے ہے اور قسم دوم میں کس معنی کے اعتبار سے۔

(۶) مقدمہ ششم جس میں اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی شان تحقیق بہت ہی بلند مقام پر دکھائی دیتی ہے اور جس کا فہم ہم سب کے بس کی بات نہیں اس میں آپ نے یہ فرمایا ہے کہ جس طرح بعض حجر، حاکم کے حکم کے محتاج ہیں پھر حکم سے کبھی حجر حسی حاصل ہوتا ہے اور کبھی حجر شرعی اسی طرح قضا کی تقرری فک حجر ہے جو حکم والی کا محتاج ہے اس کی بھی دو قسمیں ہیں تقسیم حسی و شرعی یا دنیوی و دینی۔

قضاے دنیوی کے لیے صرف والی کی جانب سے تقرر کافی ہے اگرچہ والی اور مولّی دونوں غیر مسلم ہوں۔ لیکن قضاے دینیہ شرعیہ کہ جس میں ولایت قسم دوم ہے اور مقدمات قسم دوم یعنی مسلمان کے لیے حکم شرعی جدید کا پیدا کرنا اس کے لیے جس طرح مولّی یا مقلّد بالفتح یعنی اس قاضی کا مسلم ہونا شرع مطہر نے لازم مانا جس کا روشن ثبوت گزرا یوں ہی مُولّی یا مقلّد بالکسر یعنی وہ والی شرع حاکم ذی اختیار صاحب فوج و خزانہ جس کے حکم کی طرف اس کا نصب و عزل منتہی ہو اس کا اسلام بھی لازم ہے کہ قضا ولایت مستقلہ نہیں بلکہ ولایت مقلد سے مستفاد ہے اور عدم مفید وجود

نہیں ہو سکتا۔ [۱]

غیر مسلم جج یا کوئی غیر مسلم حکمراں کبھی بھی مسلمانوں کا قاضی شرع نہیں ہو سکتا اس لیے کہ قضا شریعت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مطابق فیصلہ کرنے کو کہا جاتا ہے اور اس میں قاضی شرع کو مسلمانوں پر بہت سے معاملات میں ولایت شرعی حاصل ہوتی ہے اور کافر اس ولایت کا اہل نہیں اس لیے مسلمانوں پر قضا کا بھی اہل نہیں ہو سکتا۔

اس حقیقت کو سمجھانے کے لیے امام احمد رضا قدس سرہ نے جن مقدمات اور تحقیقات کا سہارا لیا ہے ان سے یہ مسئلہ آفتاب سے بھی زیادہ روشن ہو جاتا ہے اگر آپ بھی ان تحقیقات انیقہ سے مستفید ہونا چاہتے ہیں تو آنے والی سطور کو ملاحظہ فرمائیں۔ پہلے اعلیٰ حضرت نے یہ سمجھایا ہے کہ ولایت کی حقیقت سمجھنی چاہیے پھر اس مسئلے کی نوعیت سمجھ میں آئے گی ہم اعلیٰ حضرت کی بعینہ وہ عبارات نقل نہیں کریں گے کہ لوگوں کے لیے ان کا سمجھنا دشوار ہے بلکہ ان کی تحقیقات کا جو مآل اور حاصل ہے وہ نقل کریں گے۔

آپ فرماتے ہیں:

ولایت مجبرہ جس کی تعریف تنفیذ القول علی غیرہ شاء أو أبی ہے یعنی دوسرے پر قول کو نافذ کرنا خواہ وہ چاہے یا انکار کرے اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ولایت عرفیہ دنیویہ یہ ولایت وہ ہے جو بادشاہ کو اپنی رعایا اور حاکموں کو محکومین پر ہوتی ہے اور اس کے سبب سلاطین کو والیان ملک کہا جاتا ہے۔ دوسری ولایت، شرعیہ دینیہ یہ خالص دینی شرعی اور مذہبی ولایت ہے جو حقیقۃً اللہ عزوجل کو پھر اس کی عطا سے اس کے رسول ﷺ کو حاصل ہے اس ولایت کی حقیقت ذاتیہ کا بیان اس آیت میں ہے ما لهم من دونه من ولی۔ ان کے لیے اللہ کے سوا کوئی ولی نہیں۔ اور حقیقت عطائیہ کا بیان اس آیت کریمہ میں ہے: اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ

(۱) فتاوی رضویه، ج:۷، ص:۵۰۱، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی

اَنْفُسِهِمْ [۱] یہ نبی مسلمانوں کے ان کی جان سے زیادہ مالک ہیں اور دونوں کو اس آیت کریمہ میں جمع کر دیا گیا ہے: وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴿۳۶﴾ [۲] اور نہ کسی مسلمان مرد نہ مسلمان عورت کو پہنچتا ہے کہ جب اللہ ورسول کچھ حکم فرمادیں تو انھیں اپنے معاملہ کا کچھ اختیار رہے اور جو حکم نہ مانے اللہ اور اس کے رسول کا وہ بے شک صریح گمراہی میں بہکا۔

پھر رسول اللہ ﷺ کی تشریع و تفویض و انابت (سپرد کرنے اور نائب بنانے) سے اسے جسے انھوں نے اپنی ولایت اصلیہ سے جتنی باتوں میں اختیار ظلی عطا فرمایا۔ ماذون مطلق کو مطلق اور ماذون امر خاص کو اس امر خاص میں اور اس اختیار ظلی کا بیان اس آیت کریمہ میں ہے: الَّذِىْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ [۳] وہ جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔ اور تینوں قسموں کا اجتماع یعنی ولایت حقیقیہ ذاتیہ، ولایت عطائیہ، اور ولایت ظلیہ اس آیت کریمہ میں ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ. [۴] اے ایمان والو حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور ان کا جو تم میں حکومت والے ہیں۔ [۵]

مذکورہ آیت کے ضمن میں اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بہت ہی فائدے کی ایک بات تحریر فرمائی ہے۔ **اول:** یہی سر ہے کہ نوع دوم پر اطیعوا مکرر آیا کہ ذاتیہ و عطائیہ دو حقیقتیں ہیں اور نوع سوم کو اسی اطیعوا دوم کے نیچے مندرج فرمایا کہ ظل

---

(۱) الاحزاب، آیت:۶.
(۲) الاحزاب، آیت:۳۶، پ:۲۲.
(۳) البقرہ، آیت: ۲۳۷.
(۴) النساء، آیت: ۵۹.
(۵) فتاوی رضویہ ۷/ ۴۹۲-۴۹۳، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی

اصل سے جدا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔[۱]

مذکورہ بالا افادہ سے امام اہل سنت کی دقت نظر، جودت فکر، اور نکتہ آفرینی اور اجتہادی شان کا اندازہ ہوتا ہے۔

مذکورہ تفصیلات سے یہ بات روشن ہو گئی کہ ولایت شرعیہ صرف اللہ عزوجل پھر اس کے رسول ﷺ پھر ان کی تفویض سے دوسرے مسلمانوں کو حاصل ہے۔ کسی کافر کو حاصل نہیں اور ولایت عرفیہ دنیویہ یہ عام ہے مسلمان یا کافر کے ساتھ مختص نہیں ان دونوں ولایتوں میں منشا و مقصد نتائج اور لوازم کے اعتبار سے مختلف وجوہ سے فرق ہے۔

(۱) ولایت عرفیہ غلبہ و استیلا سے حاصل ہوتی ہے اور شرعیہ بعطاے شرع (۲) عرفیہ ملکی مسئلہ ہے اور شرعیہ مذہبی و دینی (۳) عرفیہ مقصد سلاطین ہے اور شرعیہ مقصد خاص دین (۴) عرفیہ سے شئ غیر موجود موجود ہو جاتی ہے اور شرعیہ سے حکم شرعی غیر حاصل حاصل (۵) عرفیہ دنیا میں مؤثر ہے اور شرعیہ عقبی میں (۶) عرفیہ فوج و سپاہ و تیغ و سلاح کے سایہ میں ہے اور شرعیہ فقیر و محتاج کو بھی بقدر عطا حضور ﷺ کا ظلی عطیہ وغیرہ ان فرقوں سے یہ واضح ہو گیا کہ غلبہ و استیلا سے جو ولایت حاصل ہوتی ہے وہ عرفیہ دنیویہ ہوتی ہے اور بعطاے شرع جو حاصل ہوتی ہے وہ شرعیہ ہوتی ہے۔

اس امر کی تحقیق کہ ولایت عرفیہ مسلمانوں کے ساتھ خاص نہیں

شریعت مطہرہ اسلامیہ نے ولایت عرفیہ کو جس سے آدمی والیِ ملک اور حاکم و بادشاہ بن جاتا ہے اور رعایا کو اس کی پابندی لازم ہوتی ہے اس کے حال پر چھوڑا ہے اسے مسلم یا غیر مسلم کے ساتھ خاص نہیں فرمایا جس طرح وہ عرف میں کسی سے خاص نہیں۔ اس لیے کہ یہ ولایت احکام تکوینیہ کے زیر اثر ہے جسے اللہ عزوجل چاہے ملے اور شرع کی بحث صرف احکام تشریعیہ سے ہوتی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ. تم

(۱) فتاوی رضویہ، ج:۷/ ۴۹۳، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی

فرمادو اللہ بادشاہت کا مالک ہے جسے چاہتا ہے حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔(پ:۳، آل عمران) اس پر اعلیٰ حضرت نے فرمایا اس ''مَنۡ تَشَآءُ'' میں کوئی خصوصیت اسلام کی نہیں لہٰذا قرآن مجید نے زمانہ یوسف علیہ السلام میں بادشاہ مصر کو جابجا لفظ ملک سے تعبیر فرمایا: وَقَالَ الۡمَلِكُ اِنِّیۡۤ اَرٰی. وَقَالَ الۡمَلِكُ ائۡتُوۡنِیۡ بِهٖ . مَاكَانَ لِيَاۡخُذَ اَخَاهُ فِیۡ دِیۡنِ الۡمَلِكِ. اور وہ غلط تعبیر سے پاک و منزہ ہے یوں ہی حضرت بلقیس کو ان کے اسلام سے پہلے قول ہدہد میں بلفظ اِنِّیۡ وَجَدۡتُّ امۡرَاَةً تَمۡلِكُهُمۡ (بے شک میں نے ایک عورت کو ان لوگوں کا بادشاہ پایا) ذکر فرمایا اور وہ تقریر علی الغلط سے طاہر و مبرّا ہے تو ثابت ہوا کہ بادشاہ اگرچہ غیر مسلم ہو ضرور والی ملک اور ولایت قسم اول رکھتا ہے۔

دنیاوی معاملات سے آگاہی

ایک مفتی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ دنیاوی معاملات، لوگوں کے عرف وعادات لین دین کے طور طریقے سے باخبر ہو حالات زمانہ پر اس کی نگاہ ہو، اس زاویے سے اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی زندگی کا جب مطالعہ کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر دینی مشاغل کی کثرت اور ہجوم کار کے باوجود رفتار زمانہ اور معاملات دنیوی پر گہری نگاہ اور عقابی نظر رکھتے ہیں۔جب کہ ایک مفتی اگر اتنی باریک بینی سے اشیا کی قیمتوں لین دین کے طریقوں کا جائزہ نہ لے تو بھی اس کے کام میں اختلال واقع نہ ہوگا۔ذیل کی سطور میں اسی طرح کے چند شواہد ملاحظہ کریں۔

﴿۱﴾

بیس برس پہلے (اعلی حضرت علیہ الرحمہ کے زمانے سے) ہندوستان میں دوطرح کے پیسے رائج تھے، ایک سکّہ زدہ، دوسرے تانبے کے لمبے لمبے ٹکڑے

بحر الرائق وغیرہ میں ہے کہ مال کی چار قسمیں ہیں:

اول: وہ جو ہر حال میں ثمن ہی ہے جیسے سونا اور چاندی۔ **دوم:** وہ جو ہر حال

میں **مبیع** ہے جیسے چوپائے اور وہ کپڑے جو مالیت میں ایک جیسے نہ ہوں۔ **سوم:** وہ مال جس کی ذات میں کوئی ایسا وصف ہے جس کے سبب وہ کبھی ثمن اور کبھی مبیع ہوتا ہو اور **قسم چہارم** یہ ہے کہ وہ حقیقتاً کوئی متاع ہو اصطلاحاً ثمن جیسے پیسے۔

قسم چہارم کے مال کا قانون یہ ہے کہ اگر یہ اصطلاح خاص کی وجہ سے ثمن قرار پائیں تو جب تک چلن جاری ہے اسی وقت تک ثمن رہیں گے اور چلن بند ہونے کے بعد محض متاع رہ جائیں گے اور اہل اصطلاح اگر یہ چاہتے ہیں کہ کسی چیز کو ثمن قرار دیں تو انھیں اس کی قیمت کا اندازہ ثمن خلقی کے اعتبار سے لگانا ہوگا کہ عرضی چیز کا قیام توذاتی ہی سے ہوتا ہے۔

اس کے بعد اعلیٰ حضرت تحریر فرماتے ہیں:

تو ۶۴؍ ہندی پیسے یا ۲۱؍ عربی ہللے ایک روپے قرار دیتے ہیں۔ یوں ہی اس کے ماسوا ہیں۔ اور انھیں اختیار ہے جیسے چاہیں اصطلاح مقرر کریں کیوں کہ اصطلاح میں کوئی روک ٹوک نہیں۔ بیس برس پہلے ہندوستان میں دو طرح کے پیسے رائج تھے، ایک سکّہ زدہ (ڈبل) دوسرے تانبے کے لمبے لمبے ٹکڑے وزن میں ڈبل پیسے سے قریب دونے کے (منصوری) ڈبل پیسے روپے کے ۶۴؍ سے نہ زائد ہوتے نہ کم اور منصوری کا بھاؤ گھٹتا بڑھتا رہتا تھا۔ اور کبھی ایک روپے کے اسّی (۸۰) ہو جاتے تھے یہاں تک کہ چلن نہ رہا اور جاتے رہے تو یہ سب اصطلاح کی جانب راجع ہے اور اس میں شرع مطہر کی طرف سے کوئی روک نہیں۔(۱)

مذکورہ بالا سطور سے امور دنیا سے اعلیٰ حضرت کی کامل آگاہی کا پتا چلتا ہے علاوہ ازیں کس پیسے کی کتنی قیمت آج ہے اور بیس برس پہلے کیا تھی۔

﴿۲﴾

ہمارے شہروں میں معقول گنتی کے چھوہارے ایک پیسہ کے ہوتے ہیں اور یہاں اور بھی سستے ہیں

اعلیٰ حضرت نے قنیہ کی فرع کے رد میں چند نقلی دلیلیں ذکر فرمائی ہیں ان میں سے

(۱) فتاوی رضویہ، ج: ہفتم، ص: ۱۳۵، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی

ایک دلیل یہ ہے کہ ہمارے تمام ائمۂ کرام کا اس بات پر اجماع ہے، متون و شروح و فتاوائے مذہب کا اس پر اتفاق ہے کہ ایک چھوہارا دو چھوہاروں اور ایک اخروٹ دو اخروٹوں کے بدلے بیچنا جائز ہے اور فتح القدیر میں یہ بھی زائد کیا کہ دو سوئیوں کے بدلے ایک سوئی۔

اس ضمن میں اعلیٰ حضرت تحریر فرماتے ہیں:

وکل أحدیعلم أن لیس شيء منها یساوی فلسا ففی بلادنا تکون عدة صالحا من التمر بفلس وهو ههنا أرخص وکذلك الجوز وهوأرخص فی بلادنا وثمه تجد الإبر بفلس من ثمان إلیٰ خمس و عشرین.

اور ہر شخص جانتا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز ایک پیسہ کی نہیں ہوتی ہمارے شہروں میں معقول گنتی کے چھوہارے ایک پیسہ کے ہوتے ہیں اور یہاں اور بھی سستے ہیں، اور ایسے ہی اخروٹ اور وہ ہمارے شہروں میں زیادہ ارزاں ہیں۔ اور ہندوستان میں ایک پیسہ کی آٹھ سے لے کر پچیس سوئیاں تک ملتی ہیں۔ تو اس مسئلہ کی صریح مخالفت ہے تمام کتب مشہورہ بلکہ نصوص جمیع ائمۂ مذہب سے۔[1]

قابل غور بات یہ ہے کہ انسان بڑی بڑی چیزوں کی قیمت اور ان قابل ذکر اشیا کے بھاؤ تاؤ سے تو واقف ہوتا ہے جن کی ضرورت اسے روز مرہ کی زندگی میں پیش آتی ہے مگر چھوٹی چھوٹی اشیا سے صرف نظر غیر شعوری طور پر ہو جاتی ہے مگر حیرت ہوتی ہے اعلیٰ حضرت کی ذات پر کہ آپ چھوٹی چھوٹی چیزوں کی قیمتوں سے بھی آگاہ ہیں۔

﴿٣﴾

لوگوں کے معاملات سے آگاہی کی اور مثال

لوگوں کے معاملات سے آگاہی کی ایک اور مثال اس ضمن میں ملاحظہ فرمائیں:

قنیہ میں مسائل کے ضمن میں ایک فرع ذکر کی گئی ہے کہ ایک ٹکڑے روٹی کی بیع باطل ہے۔ لأن أدنی القیمة التی تشترط لجواز البیع فلس.اهـ. اس لیے کہ جواز بیع کے لیے

(١) فتاوی رضویه، ج:٧، ص:١٤١، مطبوعہ: رضا اکیڈمی، ممبئی

کم سے کم ایک پیسہ قیمت ہونا شرط ہے۔

قنیہ کی اس فرع کا اعلیٰ حضرت نے نقلی دلائل سے بھی رد فرمایا ہے اور عقلی دلائل سے بھی۔ عقلی دلائل کے تحت آپ نے جو تحریر فرمایا ہے اس کا ترجمہ تلخیص کے ساتھ درج ذیل ہے:

ملک ہندوستان میں اکثر فقرا کی معیشت خرید و فروخت پر ہے جو پیسے کے حصے دھیلے (نصف پیسہ) چھدام، دمڑی وغیرہ سے ہوتی ہے۔ تو بہت سے فقیر اپنے سالن کے لیے کوئی ساگ نصف پیسے کا خرید لیتے ہیں اور اس میں نصف پیسے کا تیل ڈال لیتے ہیں اور تینوں مسالے چھدام کے اور لہسن پیاز چھدام کے اور چھدام کا نمک۔ تو پونے دو پیسے میں اس کی ہانڈی تیار ہو جاتی ہے اور اسے صبح و شام دو وقت کر کے کھا لیتے ہیں اور اپنے چراغ کے لیے آدھے پیسے کا تیل خریدتے ہیں جو شام سے آدھی رات تک ان کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اور میٹھے پانی کی بڑی مشک آدھے پیسے کو مل جاتی ہے اور ابھی تھوڑا ہی زمانہ گزرا کہ پیسے کی تین مشکیں ملتی تھیں، اور دیا سلائی کی ڈبیہ آدھے پیسے کو مل جاتی تھی، اور اپنے بال بچوں کے لیے ہندوستانی میووں میں سب سے مزے دار میوہ جسے اہل عرب ''عَنَبۃٌ'' کہتے ہیں اور فارسی میں انبہ اور ہندی میں آم یہ بہت سے آدھے پیسے میں مل جاتے ہیں۔

ایسے ہی جامن اور تمر ہندی یعنی املیاں ایک چھدام کو (یعنی ایک پیسے کا چوتھائی حصہ) اور اگر پان تمباکو کا عادی ہے تو اسے ایک رات دن کے لیے کفایت کریں آدھے پیسے کے پان۔ اور کتھا اور چھالیا اور کھانے کا تمباکو چھدام چھدام کے تو اس کی ایک دن کی حاجت سوا پیسے میں نکل جائے گی۔ اور اگر حقہ پیتا ہو تو آدھے پیسے کا تمباکو کافی ہے اور اسی طرح بہت سی چیزیں پیسہ کے حصوں سے بکتی ہیں یہاں تک کہ دمڑی اور ادھی اور اگر ایسا نہ ہو تو معاملہ تنگ ہو جائے اور کم استطاعت والوں پر ایسا بارِ گراں گزرے کہ اٹھا نہ سکیں۔ اور یہ بیعیں کہ ہزاروں سال سے مسلمانوں میں رائج ہیں اگر ہم باطل کر دیں اور ان پر لازم کر دیں کہ کبھی کوئی چیز پیسہ سے کم کی نہ خریدیں حالاں کہ ان کی حاجتیں چھدام اور دمڑی میں پوری ہو جاتی ہیں تو یہ ان پر بھاری بوجھ ڈالنا ہوگا اور یہ روشن و آسان شریعت تو نہ آئی مگر بوجھ کے دفع کرنے کے لیے۔ بلکہ اکثر اوقات اتنے پیسے انھیں ملیں گے بھی نہیں اس لیے کہ وہ سالن جو پونے دو

پیسے میں تیار ہو تا تھا اب دو آنے سے کم میں تیار نہ ہو گا۔ اور پان کہ سوا پیسے میں جس کا کام پورا ہو تا تھا اب ایک آنہ میں ہو گا۔ اور اسی پر قیاس کرو۔

تو جب اپنی ہانڈی کے لیے دو پیسے سے زائد نہ پائے، اور تم دو آنے میں اس پر لازم کرو۔ تو بتاؤ وہ کیا کرے آیا روکھا آٹا پھانکے یا جو کی خشک روٹی چبائے جس کے ساتھ کوئی سالن ایسا نہ ہو کہ اس کی اصلاح کرے۔

درج بالا تحریر سے جہاں صاحب تنویر اور قنیہ پر نقد عیاں ہے وہیں اس کلام میں اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی امور دنیا سے آگاہی، لوگوں کے معاملات، بیع و شرا، اشیا خواہ چھوٹی ہوں یا بڑی ان سب کی قیمتوں سے باخبری کا بھی پتہ چلتا ہے اور تعجب تو یہ ہے کہ یہ معاملات خود آپ کے نہیں ہیں بلکہ فقرا کے ہیں کہ بہت سے فقرا اپنے سالن کے لیے ساگ آدھے پیسے کا اور تیل آدھے پیسے کا اور تینوں مسالے دمڑی کے اور لہسن پیاز ایک دمڑی کے اور نمک ایک دمڑی کے لیتے ہیں تو پونے دو پیسے میں ان کی ہانڈی تیار ہو جاتی ہے۔ لوگوں کے معاملات اور لین دین سے آگاہی اور اس کی روشنی میں مسائل شرعیہ کی تنقیح کی یہ عظیم مثال ہے۔

یہ فتاوی رضویہ جلد ہفتم (اشاعت سنی دار الاشاعت مبارک پور، ورضا اکیڈمی، ممبئی) کے محاسن و کمالات پیش کرنے کی کوشش تھی۔ اندازہ ہے کہ مزید محنت ہو تو اور بھی جواہر زواہر سامنے آسکتے ہیں۔

لعل الله يقيض له رجلا، له الأمر، وله الحمد، والصلاة والسلام على حبيبه وآله وصحبه أجمعين.

محمد رضا قادری مصباحی
درجۂ تحقیق، سال اخیر
الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور
۱۴۳۰ھ/۲۰۰۹ء

حیات مؤلف–ایک نظر میں

بقلم خود

نام ونسب: محمد رضا قادری

پیدائش: ۹ر ذوالحجہ ۱۴۰۴ھ شب جمعرات مطابق ۵ر ستمبر ۱۹۸۴ء۔ لیکن سندوں میں دی گئی تاریخ پیدائش ۳ر فروری ۱۹۸۴ء ہے۔

والد ماجد: حضرت مولانا محمد عیسٰی برکاتی، مرید باصفا حضور سید العلما سید شاہ آل مصطفی برکاتی مارہروی قدس سرہ

والدہ ماجدہ: زبیدہ خاتون قادری بنت محمد خورشید عالم بن محمد ہارون بن کتاب علی بن شبراتی میاں

جد مکرم: ذوالمجد والمکارم، حضرت محمد صدیق قادری رضوی قدس سرہ (ولادت: ۱۹۲۱ء تخمیناً وفات: ۱۰ر صفر المظفر ۱۴۳۵ھ مطابق ۱۳ر دسمبر ۲۰۱۳ء بروز جمعہ شب شنبہ۔ ۲۸ر گتے اگہن بکرم سنبت ۲۰۷۰ سال، ۷ بجکر ۱۵ منٹ پر

پردادا: محمد جان بن مولانا محمد مہدی میاں بن پُرحَسن میاں بن نَجْم میاں بن جھلّو میاں

خاندانی پس منظر: راقم سطور کے آبا واجداد کا تعلق ملک یمن سے ہے۔ عاصم بن فرج جُحنی یمنی کی اولاد میں سے ''طلحہ بن عدی'' بغرض تجارت سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں ہندوستان تشریف لائے۔ ان کی اولاد میں سے حضرت نون علی رحمہ اللہ نے لگ بھگ پانچ سو سال قبل دارالحکومت نیپال ''کاٹھمنڈو'' کو اپنا مسکن بنایا اور کاٹھمانڈو کے ضلع ''لَلِت پور'' میں قیام فرمایا۔ خاندانی روایات اور بزرگوں کے ذریعہ یہ معلوم ہوا کہ نون علی کے دو لڑکے ہوئے فہد بن نون اور سعد بن نون ان میں سے کسی ایک کی اولاد نے بہار و نیپال کی سرحد پر واقع موضع ''مٹیہانی''، ضلع مہوتری میں بود و باش اختیار کی، یہاں کتنے دنوں تک آباد رہے کچھ معلوم نہیں، جد امجد کی زبانی کثیر مرتبہ یہ سننے کو ملا کہ ہمارے آبا و اجداد ایک زمانے تک کاٹھمنڈو کے ضلع لَلِت پور میں مقیم رہے۔ انھوں نے فرمایا کہ لگ بھگ ڈھائی سو سال پیشتر جھلّو میاں نے مٹیہانی گاؤں سے اپنے بچوں کے ساتھ ہجرت فرماکر ضلع دھنوشا کی پنچایت اوڑھی وارڈ نمبرے میں واقع ''کپٹول'' نامی گاؤں میں سکونت اختیار کرلی جہاں پہلے سے کوئی مسلمان

آباد نہ تھا بلکہ یہاں کیوٹ برادری اور دیگر غیر مسلم قومیں آباد تھیں۔ آپ کے آباد ہونے کے بعد ایک اور مسلم خاندان ''بھٹا موڑ'' کے قریب موضع ''بھٹا'' سے ہجرت کر کے یہاں سکونت پذیر ہوا اور آج یہاں انھیں دونوں خاندان کی نسلیں آباد ہیں۔ مرور ایام اور حوادث زمانہ کے باوجود عربوں کی بعض خصوصیات اس خاندان میں محسوس کی جاسکتی ہیں، مثلا حیرت انگیز قوت حافظہ، علم الانساب میں مہارت، فقیر کے جد امجد کا حافظہ اس قدر قوی تھا کہ پورے گاؤں کے خاندانوں کے شجرہائے نسب چھ سات پشتوں تک، بالتفصیل لکھوا دیے، کون کب، کہاں سے آیا، کس کی اولاد کتنی ہوئیں، کون کہاں مرا؟ وغیرہ، تیسری خصوصیت مہمان نوازی، چوتھی خصوصیت صوتی حلاوت یہ باتیں ہمارے خاندان میں اوپر سے چلی آرہی ہیں۔ باقی علم وعمل اور فضل کے اعتبار سے بھی یہ خانوادہ معروف ہے۔ میرے لکر دادا حضرت مہدی میاں، اپنے زمانے میں علاقہ بھر کی مذہبی ضرورت پوری کیا کرتے تھے۔ جد امجد نے فرمایا: کہ ان کے دادا گھوڑے سے سفر فرماتے اور دربھنگہ ضلع تک کے علاقوں کا تبلیغی دورہ فرمایا کرتے تھے۔ کوئی قرآن مجید پڑھنے میں غلطی کرتا تو فوراً اسے ٹوکتے۔ میلاد، فاتحہ، نکاح اور جنازہ لوگوں کی پڑھاتے تھے۔ ان کے پوتے اور میرے جد امجد حضرت محمد صدیق قدس سرہ اپنے زمانے کے بڑے باخبر لوگوں میں سے تھے۔ ان کی ذہانت وفطانت اور قوت حافظہ کی نظیر پورے علاقہ میں نہیں تھی، اور علم ریاضی میں ان کا پایہ بہت بلند تھا، بڑا زرخیز دماغ پایا تھا۔ کروڑوں کا حساب وہ سکنڈوں میں زبانی بتا دیا کرتے تھے۔ ریاضی کے مشکل مسائل کو وہ چٹکیوں میں حل فرماتے تھے۔ سنسکرت اور ہندی زبانوں سے اچھی طرح واقف تھے ساتھ ہی ساتھ وید و پران جیسی کتابوں کی لمبی لمبی عبارتیں انھیں یاد تھیں۔ صوم وصلوۃ کے پابند اور درود شریف کے عامل تھے۔ تقریبا ۴۰۰ سے ۵۰۰ مرتبہ درود شریف پڑھ کر سونا ان کے معمول میں شامل تھا۔ بہت بے خوف اور دلیر انسان تھے، متعدّد بار شیطانوں نے رات کے وقت میں آپ کا راستہ روکنے کی کوشش کی اور ڈرایا مگر آپ ان سے خائف نہیں ہوئے، بلکہ ان کے سامنے مقابلہ کے لیے کھڑے ہوگئے جب تک شیطان غائب نہیں ہوجاتا آپ چاقو یا لوہے کی کسی چیز کو اس کی طرف تان کر کھڑے رہتے تھے۔ علما اور مہمان نواز تھے۔ اگر آپ پڑھتے لکھتے تو اپنے عہد کے بہت بڑے عالم دین ہوتے والد کا بچپن ہی میں وصال ہوگیا اور کسب معاش کے لیے ابتدائی تعلیم بھی ترک کر دینی پڑی۔ جد امجد نے راقم سطور سے فرمایا کہ پورا بغدادی قاعدہ ایک سے دو دن میں ہم نے استاذ کو سنا دیا اور کہا یہ تو جوڑتی ہے ہے۔ والد ماجد اپنے اسلاف کے

نقش قدم پر ہیں، ان کی دینی و علمی خدمات کو بیان کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ میرے عم مکرم حضرت مفتی محمد عثمان برکاتی مصباحی بلند پایہ عالم دین، متعدّد مدارس و مساجد کے بانی ہونے کے ساتھ ملک نیپال کے عظیم دینی ادارہ مرکزی ادارۂ شرعیہ، کاٹھمانڈو کے چیف قاضی و مفتی کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہے ہیں۔ آپ کی خدمات پر تفصیلی مقالہ لکھا جاسکتا ہے۔

تدریسی خدمات: اکتوبر ۲۰۰۹ء سے اگست ۲۰۱۴ء تک ہندوستان کی معروف دعوتی درسگاہ جامعہ حضرت نظام الدین اولیا، ذاکر نگر، نئی دہلی میں بحیثیت پرنسپل و ڈائرکٹر تعلیمات تدریسی خدمت انجام دی اور تخصص فی الادب والدعوہ کے طلبہ کو عربی زبان و ادب، نحو و صرف، ترجمہ، علوم قرآن اور تاریخ عربی ادب جیسے موضوعات کو پڑھایا۔ ۱۰؍ جنوری ۲۰۱۵ء سے ارباب حل و عقد مادر علمی جامعہ اشرفیہ کی طلب پر حاضر ہوکر تدریسی خدمات کا آغاز کیا، ہنوز یہیں تدریسی خدمت سے وابستہ ہیں۔

فتاوی نویسی: ۱۴؍ فروری ۲۰۱۰ء کو عمائدین اہلسنت کی موجودگی میں ادارۂ شرعیہ دہلی کی ذمہ داری سونپی گئی جس کے بعد سینکڑوں مسائل کے جوابات یہاں سے دیے۔ اگست ۲۰۱۴ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ افسوس یہ کہ اس زمانہ کے فتاوی کا رجسٹر ایک بنگالی طالب علم کو نقل کے لیے دیا گیا جس کو انھوں نے گم کر دیا یا کسی طرح سے گم ہو گیا جواب تک مفقود ہے۔

مشاہیر اساتذہ: محدث جلیل، علامہ عبد الشکور مصباحی، سابق شیخ الحدیث، جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، خیر الاذکیا، علامہ محمد احمد مصباحی، سابق صدر المدرسین، جامعہ ہذا، سراج الفقہا، حضرت مفتی محمد نظام الدین رضوی، صدر المدرسین، جامعہ ہذا، حضرت مولانا محمد اسرار الحق صاحب لہراوی، حضرت مولانا قاری مقری نور الحق مصباحی قدس سرہ، حضرت مولانا عبد الحق مصباحی، حضرت مولانا مفتی محمد بدر عالم مصباحی، حضرت مولانا صدر الوری مصباحی، حضرت مولانا نفیس احمد مصباحی، (اساتذۂ مبارک پور) حضرت مولانا قاری مقری احمد جمال عزیزی مصباحی، مفتی آل مصطفی مصباحی، حضرت مولانا محمد صدیق مصباحی، حضرت مولانا عبد الرحمٰن مصباحی (اساتذۂ جامعہ امجدیہ، گھوسی) حضرت مولانا فروغ احمد اعظمی، حضرت مولانا تفسیر القادری قیامی، حضرت مولانا محمد قمر عالم اشرفی (اساتذۂ جمدا شاہی) حضرت مولانا عرش محمد صاحب، حضرت مولانا خورشید عالم مصباحی، حضرت مولانا محمد جعفر صادق (اساتذۂ مدرسہ عربیہ ضیاء العلوم، ادری) حضرت مولانا صوفی عزیز الرحمٰن صاحب، حضرت مفتی محمد عثمان برکاتی مصباحی، حضرت مولانا احمد حسین برکاتی (اساتذۂ نیپال)۔ اپنے عصر کے چند مشائخ سے

تبرکا بھی پڑھنے کا شرف حاصل ہوا مثلاً حضرت محدث کبیر، ممتاز الفقہا، علامہ ضیاء المصطفی قادری دامت برکاتہم سے بخاری شریف کے متعدد اسباق، حضرت بحر العلوم، مفتی عبد المنان اعظمی قدس سرہ سے الاشباہ والنظائر کا ایک سبق۔

قاعدہ بغدادی سے یسرنا القران تک کی تعلیم

تعلیم و تربیت: مقامی مکتب میں حضرت مولانا محمد حسن رضا مرحوم (ساکن، چتری، ضلع سرہا) اور حضرت مولانا محمد داؤ حسین صاحب (ساکن، ہنسپور، ضلع دھنوشا) سے اور گھر پر والدہ ماجدہ سے حاصل کی۔ قرآن مجید، فارسی اور ابتدائی اردو کی کتابیں اپنے حقیقی عم مکرم حضرت مولانا محمد احمد حسین برکاتی سے ''اورنگ''، ضلع سرہا، نیپال نام کی بستی میں پڑھیں۔ حفظ قرآن کا باضابطہ آغاز غالباً ۱۹۹۴ء میں جنت نظیر کشمیر کے ضلع جموں توی میں واقع دینی درسگاہ مدرسہ اسلامیہ، غوثیہ، کالج، رانجن میں حضرت قاری ابرار صاحب رامپوری کی درسگاہ میں کیا۔ اور تکمیل حفظ دار العلوم حامدیہ، جگدر بازار، میں حضرت حافظ قاری محمد اظہار احمد صاحب کی درسگاہ میں کی، جب کہ دورۂ قرآن، کامل ایک سال، جامعہ اشرفیہ مبارک پور میں حضرت حافظ محمد عمر مبارک پوری دام ظلہ العالی کی بافیض درسگاہ میں کیا۔

سندوں کی تفصیلات: ڈویژن

سند حفظ قرآن: الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی ۱۹۹۹ء اعلی

مولویت: دار العلوم علیمیہ، جمدا شاہی، ضلع بستی، یوپی ۲۰۰۳ء اعلی

سند عالمیت: الجامعۃ الامجدیۃ الرضویہ، گھوسی، ضلع مئو، یوپی ۲۰۰۵ء ممتاز

سند روایت حفص: الجامعۃ الامجدیۃ الرضویہ، گھوسی، ضلع مئو، یوپی ۲۰۰۵ء ممتاز

سند فضیلت: الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی ۲۰۰۷ء اعلی

سند قراءت سبعہ: الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی ۲۰۰۷ء ممتاز

سند اختصاص فی الفقہ: الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی ۲۰۰۹ء اعلی

بی اے آنرز (اسلامک اسٹڈیز) جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۰۱۴ء

ایم، اے (تاریخ) مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد ۲۰۱۸ء

اترپردیش عربی فارسی مدرسہ بورڈ سے: منشی، مولوی، عالم، کامل، فاضل دینیات، فاضل معقولات

شہادۃ نجاح، الازہر انسٹی ٹیوٹ، بدایوں شریف، ۱۱؍فروری ۲۰۰۷ء ممتاز مع الشرف

۸ تا ۱۱ر فروری ۲۰۰۷ء کو الازہر انسٹی ٹیوٹ، بدایوں شریف کی طرف سے شہید بغداد عالم ربانی حضرت مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری ازہری نور اللہ مرقدہ کے زیر اہتمام آل انڈیا مقابلہ علوم حدیث مابین طلبۂ مدارس و جامعات منعقد ہوا جو پانچ مرحلوں میں منقسم تھا، راقم سطور نے تمام مراحل طے کرتے ہوئے مقابلے میں اول پوزیشن حاصل کی جس سے مادر علمی اور وطن عزیز کا نام روشن ہوا۔ دس ہزار روپے نقد مع توصیفی اسناد و کتب بدست حضرت سید محمد اشرف مارہروی برکاتی بطور انعام دیے گئے۔

ڈپلومہ ان پروفیشنل عربک کورس، دو سالہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۲۰۱۳ء

بیعت و ارادت: ۱۶ر رجب المرجب ۱۴۲۱ھ / ۱۵ر اکتوبر ۲۰۰۰ء کو شب میں جانشین فاتح بلگرام، رئیس الاتقیا حضرت مولانا سید شاہ محمد اویس مصطفی قادری صغروی، دامت برکاتہم العالیہ، سجادہ نشیں خانقاہ عالیہ قادریہ چشتیہ، بڑی سرکار، بلگرام شریف کے دست حق پرست پر مدرسہ عربیہ اظہار العلوم جہاں گیر گنج میں بیعت کی، جب کہ میری عمر صرف ۱۶ر سال کے قریب تھی۔

بیعت سلوک: داعی اسلام، قدوۃ السالکین، شیخ طریقت حضرت مولانا صوفی شاہ محمد ظہیر عالم قادری برکاتی، زیب مسند ارشاد خانقاہ عالیہ قادریہ چشتیہ راہ سلوک، چاند پور، ضلع مرادآباد، یوپی کے ہاتھ پر ۲۰۱۱ء کے اواخر میں بیعت سلوک کا شرف حاصل کیا اور سلوک کی پوری تربیت انھیں سے حاصل کی۔

بیعت سلوک نقشبندیہ: ۱۰ر مارچ ۲۰۱۱ء کو شیخ العالم، قدوۃ العرفا حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان نقشبندی مجددی دامت برکاتہم العالیہ۔ سجادہ نشیں خانقاہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ خیریہ، کمال پور شریف کے ہاتھوں پر سلسلۂ نقشبندیہ میں طالب بیعت ہوا۔

اجازت و خلافت: (۱) سلسلۂ عالیہ قادریہ رضویہ نوریہ

خلیفۂ حضور مفتی اعظم ہند، حضرت مفتی قاضی غلام یس صاحب، قاضی شہر بنارس دام ظلہ العالی

مؤرخہ ۲۷ر نومبر ۲۰۱۵ء بمقام جنک پور، نیپال

(۲) سلاسل عالیہ قادریہ، چشتیہ، رزاقیہ، سلیمانیہ، فردوسیہ، نقشبندیہ

نبیرۂ حضرت قاضی حمید الدین صدیقی ناگوری دہلوی، حضرت صوفی شاہ محمد رئیس احمد قادری چشتی برکاتی صدیقی، دہلوی (وصال: ۴ر محرم الحرام ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۳ر ستمبر ۲۰۱۸ء) خلیفہ ذاکر خاندان برکات، مفتی مظفر احمد داتا گنجوی، بدایونی (۱۹۳۲ء-۱۴۲۷ھ)

مؤرخہ ۸؍ شوال المکرم ۱۴۳۹ھ بمقام چاند پور، مرادآباد

(۳) سلسلۂ قادریہ رضویہ نوریہ

حضرت مفتی محمد انوار الحق مصطفوی، پیچی باغ، بریلی شریف، یوپی

مؤرخہ: ۹؍ شعبان ۱۴۳۹ھ مطابق ۲۶؍ اپریل ۲۰۱۸ء بمقام بست پور، سرلاہی، نیپال

(۴) اجازۃ الطریقۃ القادریۃ

فضیلۃ الشیخ السید الشریف احمد فتاح فرج الشیخلی البغدادی قدس سرہ (م ۲۷؍ فروری ۲۰۲۱ء)

۶؍ صفر المظفر ۱۴۴۱ھ بمقام دولت خانہ صوفی سلطان چشتی، الہ آباد، یوپی

اجازۃ الطریقۃ الرفاعیہ، حضرت سید احمد فتاح فرج الشیخلی البغدادی، ۷؍ صفر المظفر ۱۴۴۱ھ

(۵) اجازۃ الطریقۃ القادریۃ الرضویہ

محدث جلیل، استاذ الاساتذہ، حضرت علامہ عبد الشکور مصباحی حفظہ اللہ و رعاہ، شیخ الحدیث، جامعہ اشرفیہ، مبارک پور

مؤرخہ ۷؍ صفر المظفر ۱۴۴۱ھ بدولت خانۂ حضرتِ اقدس الہ آباد

(۶) اجازۃ الطریقۃ النقشبندیۃ المجددیۃ

قدوۃ العرفا، شیخ العالم، حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان الخالدی النقشبندی المجددی، دامت برکاتہم العالیہ

مؤرخہ ۸؍ مارچ ۲۰۲۱ء مطابق ۲۴؍ رجب المرجب ۱۴۴۲ھ بمقام خانقاہ نقشبندیہ مجددیہ، خیریہ، کمال پور شریف، تحصیل نارائن پور، ضلع مرزاپور، یوپی

قلمی نگارشات ـ تحقیق، تالیف، ترجمہ وتعلیقات از سنہ ۲۰۰۴ء تا ۲۰۲۱ء

۱. شرح ہدایۃ النحو (بحث، اسم وفعل وحرف) سنہ تالیف ۲۰۰۴ء زیر طبع
۲. زبدۃ مباحث القطبی سنہ تالیف ۲۰۰۴ء زیر طبع
۳. ترجمہ وتعلیق علی مدارک التنزیل سنہ تالیف ۲۰۰۶ء غیر مطبوعہ
۴. شرح وتعلیق علی تفسیر القاضی البیضاوی سنہ تالیف ۲۰۰۷ء غیر مطبوعہ
۵. ترجمہ وشرح دیوان الحماسۃ لابی تمام سنہ تالیف ۲۰۰۷ء غیر مطبوعہ
۶. دروس بخاری شریف سنہ تالیف ۲۰۰۷ء غیر مطبوعہ

۷. حاشیہ مجانی الادب (عربی) سنہ تالیف ۲۰۰۹ء غیر مطبوعہ

۸. امام احمد رضا کا فقہی کمال فتاوی رضویہ ج ہفتم کے آئینے میں سنہ تالیف ۲۰۰۹ء زیر طبع

۹. الفیوض الجیلانیۃ فی الفتاوی القادریۃ سنہ تالیف ۹-۲۰۰۸ء زیر طبع

۱۰. قادری ڈائری (روزنامچے) سنہ ترتیب از ۲۰۰۶ء تا ۲۰۱۵ء زیر طبع

۱۱. تذکرہ حضرت محمد صدیق قادری و مسلمانان کپٹول سنہ تالیف ۲۰۱۲ء زیر طبع

۱۲. حاشیہ تاریخ الادب العربی لاحمد حسن الزیات، ڈیڑھ سو صفحات کا (بزبان عربی) ۲۰۱۴ء غیر مطبوعہ

۱۳. مدارس اسلامیہ کا نصاب تعلیم، نظام تدریس اور نظام مالیات سنہ تالیف ۲۰۱۵ء غیر مطبوعہ

۱۴. التصوف یکافح الإرھاب ویتحدی التطرف الفکری سنہ تالیف ۲۰۱۶ء مطبوعہ

۱۵. نیپال میں اسلام کی تاریخ، ۲۰۱۷ء مطبوعہ

۱۶. نیپال اور نیپالی مسلمانوں کو درپیش چیلنج ۲۰۱۸ء مطبوعہ

۱۷. The Sufism Fights the Terrorism ۲۰۱۹ مطبوعہ

۱۸. सूफीवाद आतंकवाद का अन्त करता है ۲۰۲۰ء زیر طبع

۱۹. تصوف کے ذریعہ دہشت گردی کا خاتمہ اور فکری انتہاپسند کو چیلنج ۲۰۲۰ء زیر طبع

۲۰. شخصیات اسلام ۲۰۲۰ء زیر طبع

۲۱. تعمیر امت نیپال ۲۰۲۰ء زیر طبع

۲۲. آئینہ شعور و آگہی ۲۰۲۰ء زیر طبع

۲۳. اقوال حکمت سنہ تالیف ۲۰۲۰ء زیر طبع

۲۴. منہاج السالکین شرح منہاج العابدین ۲۰۲۰ء غیر مطبوعہ

۲۵. تفسیر القرآن الکریم۔ (پارہ ۲۸، ۲۹، ۳۰) تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل قرآن کریم کی علمی، فکری، لسانی، بلاغی اور سائنٹفک تفسیر۔ ۲۰۲۰ء غیر مطبوعہ

۲۶. القول الصحیح فی تعیین الذبیح سنہ تالیف ۲۰۰۷ء غیر مطبوعہ

۲۷. الموجز فی فقہ اللغۃ العربیہ زیر ترتیب

۲۸. اسفار و مشاہدات ۲۰۲۱ء غیر مطبوعہ

۲۹. الخطبات العزیزیۃ العربیۃ للجمعہ غیر مطبوعہ

۳۰. یادوں کے نقوش ۲۰۲۱ء غیر مطبوعہ

موجودہ مشغلہ: تدریس، تصنیف، تحقیق، عزیز المساجد، جامعہ اشرفیہ میں جمعہ کی امامت و خطابت، دعوت و تبلیغ کے لیے اسفار، تحریک و تنظیم کی ذمہ داریاں، مباک پور میں ہر ہفتہ دو مقامات پر حلقات ذکر و فکر کا اہتمام اور عوام کی روحانی تربیت۔

عہدے اور ذمہ داریاں: مدرس جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، رکن خانقاہ قادریہ چشتیہ راہ سلوک (انڈیا) سرپرست و خادم اعلی راشٹریہ علما کونسل، نیپال، خادم راہ سلوک سوشل ویلفیر سوسائٹی، نیپال، و سرپرست، کلیہ سیدہ فاطمہ للبنات، جلیشور، ضلع مہوتری، نیپال

ازدواجی زندگی: مؤرخہ ۱۴/ جون ۲۰۰۴ء کو الحاج محمد رفیق برکاتی صاحب، ساکن، لوکہا بازار، ضلع مدھوبنی بہار کی صاحبزادی، نازنین بیگم قادری سے عقد نکاح ہوا جن سے (۱) غلام محی الدین جیلانی (۲/ جولائی ۲۰۰۶ء) (۲) محمد ارشد القادری (۲۶/ جون ۲۰۱۰ء) (۳) عائشہ فاطمہ (۱۶/ جون ۲۰۱۲ء) (۴) شاہ ولی اللہ (۲۷/ اگست ۲۰۱۵ء) (۵) زہرا بتول قادری (۹/ جون ۲۰۲۰ء) پیدا ہوئے۔

برادران و ہمشیرگان: ۱۔ محمد حامد رضا ۲۔ محمد عاشق رضا۔ حامد رضا پیدائش کے ایک ڈیڑھ ماہ بعد اور عاشق رضا پیدائش کے چند لمحوں بعد وصال کر گئے۔ ۳۔ فاضلہ قاریہ، مقتیہ مہر النسا امجدی، پرنسپل کلیہ فاطمۃ الزہرا للبنات، جنک پور ۴۔ فاضلہ قاریہ زیب النسا امجدی، نائب پرنسپل کلیہ فاطمۃ الزہرا للبنات، جنک پور، دونوں درجۂ فضیلت تک درس دیتی ہیں۔

اسفار و زیارات: اجمیر شریف، مارہرہ شریف، بلگرام شریف، بریلی شریف، دہلی شریف، کلیر شریف، دیوہ شریف، بدایوں شریف، کچھوچھہ شریف۔ممبئی، کلکتہ، حیدرآباد، سری نگر، جموں، کاٹھمانڈو، پوکھرا، براٹ نگر، بٹول

کشمیر، مہاراشٹر، دہلی، ہریانہ، اتراکھنڈ، جھارکھنڈ، اڑیسہ، بنگال، بہار، کرناٹک، گجرات، پنجاب تلنگانہ بشمول اترپردیش ریاستوں کے اسفار، نیپال میں پردیس نمبر ۱، ۲، ۴، ۵ میں اسفار ہوئے۔

عراق مقدس (۲۰۱۹)، بغداد شریف، کرخ، مدین، کاظمین، بابل، نجف اشرف، کربلائے معلی وغیرہ۔

دوحہ، قطر (۲۰۱۹ء)۔

دبئی (۲۰۱۹ء)

Imam Ahmed Raza ka Fiqhi Kamaal
(March 2021)
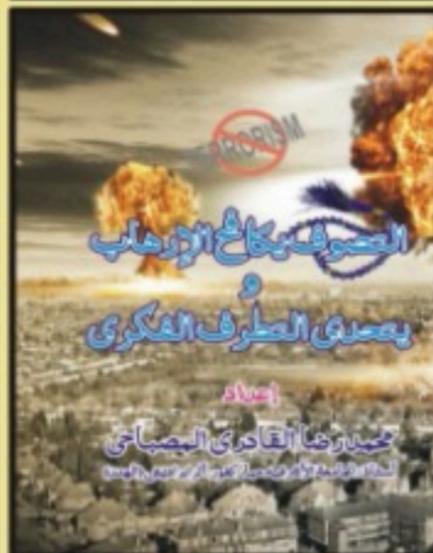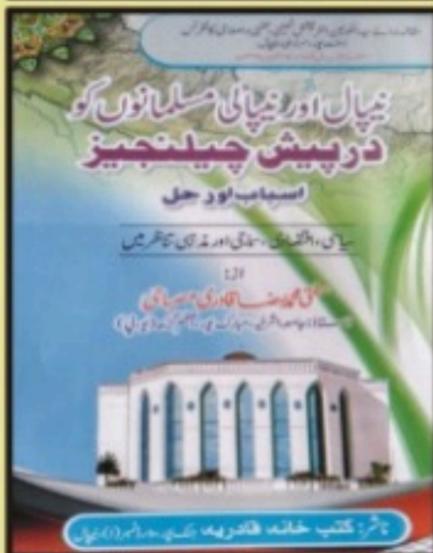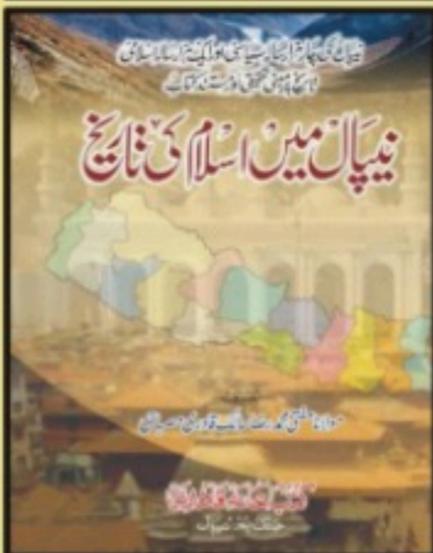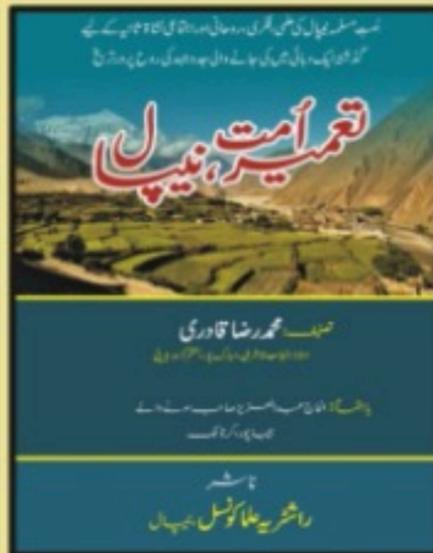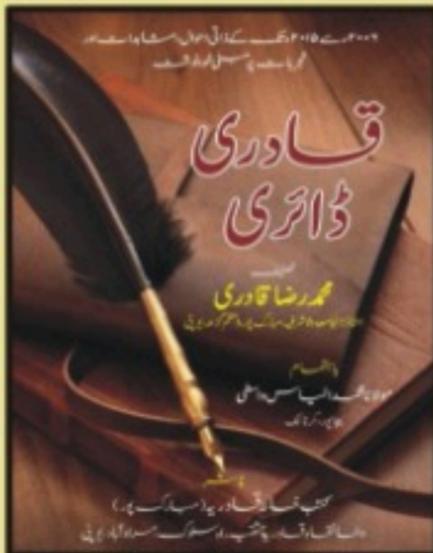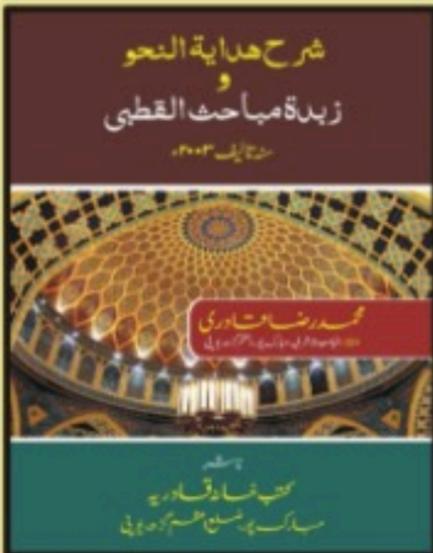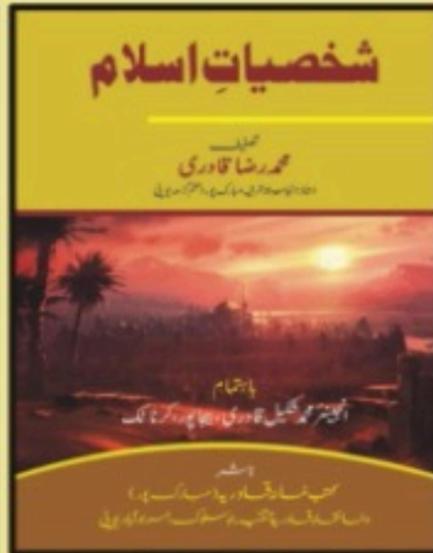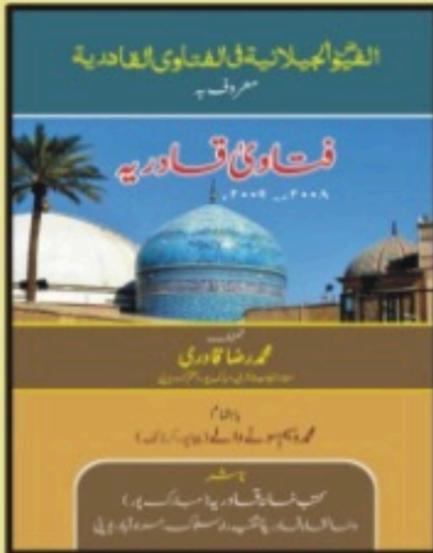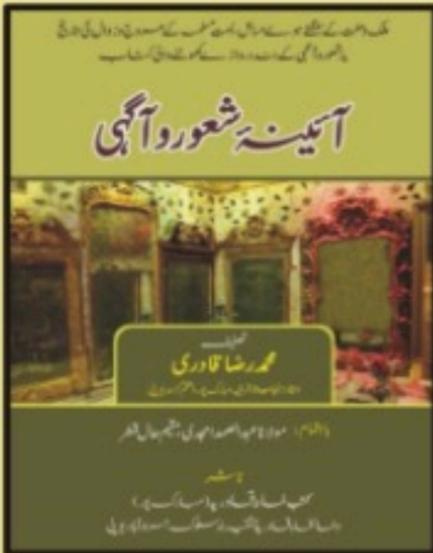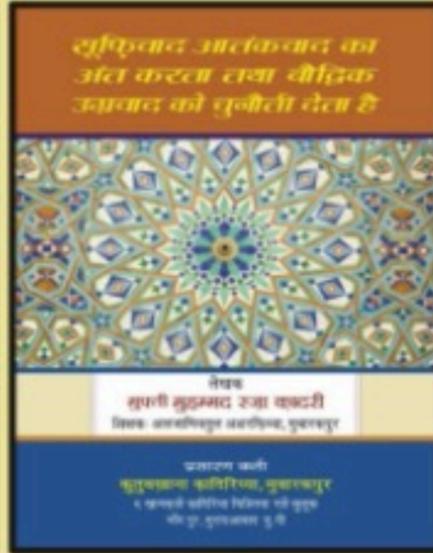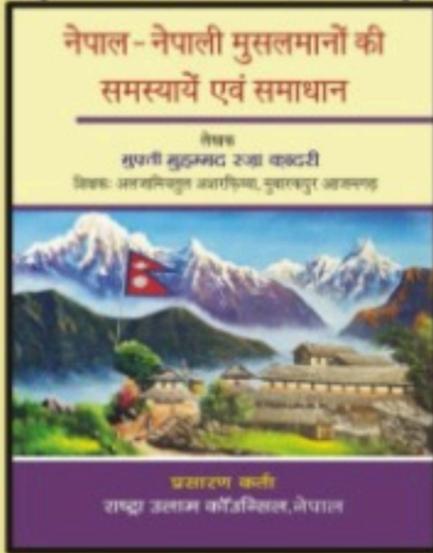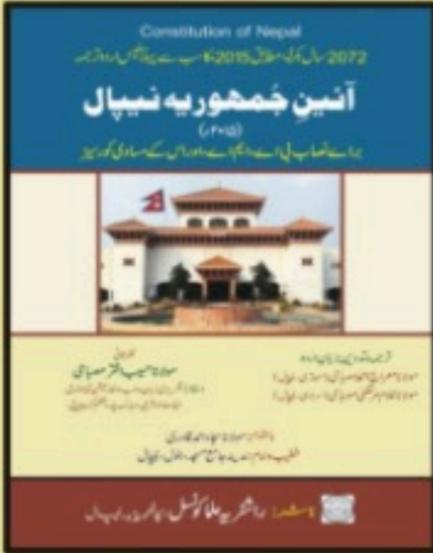
₹ 150/-

Kutub Khana Quadriya

Mubarakpur, Jila Azamgarh, up